آجکل

ابوالکلام نمبر



اگست ۱۹۵۸ء
شراون ۔ بھادوں شک سمت

ایک روپیہ

"ابوالکلام نمبر" کے لئے



وزیر اعظم کا پیغام

82465

اس سال کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے ہندوستان ہی میں ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کے دل و دماغ پر شدید اثر ہوا ہے۔ اس کی تھوڑی سی جھلک اس دن دہلی میں نظر آئی جب کہ دہلی کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں مولانا کو اپنا آخری نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

ہم جب بعض چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گی۔ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی ہمیں کچھ ایسا ہی گمان ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی ایسا شخص اچانک اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کی موت ہمارے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کی شخصیت کا نشو و نما قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی سے زیادہ مدت میں ہوئی۔ انھوں نے قومی تحریک کے مختلف دور دیکھے اور ان میں حصہ لیا۔ وہ اس کی جد و جہد، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے منتہائے مقصد کی تکمیل میں شریک رہے۔ وہ اس تحریک کا ایک اہم جزو تھے اور انھوں نے بڑی حد تک اس کی تشکیل کی۔ پھر بھی وہ ایک جید عالم اور انفرادیت پسند رہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ ہندوستانی عوام کے انبوہ کثیر میں یکہ و تنہا حیثیت کے مالک رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی صرف اسی کی وجہ سے انھیں ہماری قومی تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔

اس کے علاوہ ان کی ذات غیر معمولی علمیت اور حیرت افزا ذہانت کی حامل تھی جس پر کبھی جذبات یا تعصب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں ہندوستان کی اس گوناگوں تہذیب کا عکس پایا جاتا تھا جسے بہت سے بیرونی دھاروں نے متاثر اور مالا مال کیا ہے۔

بعض اعتبار سے اُن کی طرزِ فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا۔ اور وہ اُس دور کے شعور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنھوں نے اس مقصد کو جس کے لئے وہ عمر بھر کوشاں رہے، ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔ پرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اُسے واپس نہیں لا سکتے لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم مولانا آزاد کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھ سکتے ہیں۔

جواہر لال نہرو

نئی دہلی
۵ جولائی ۱۹۵۸ء

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

(سال نامہ)
ابوالکلام نمبر

مجلسِ ادارت

محمد مجیب	جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور	حیدرآباد
گوپی ناتھ امن	دہلی
خواجہ احمد فاروقی	دہلی
زمان راہی	سری نگر

یو. ایس. موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

جی. ایس. ایس. راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر ایڈیٹوریل

جی. منجا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو سیکرٹری
(مدیرِ مسؤل)

اسسٹنٹ ایڈیٹر ـ مظفر شاہ

سرورق :- مولانا ابوالکلام آزادؒ کی روغنی تصویر
(ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے ذخیرۂ تصاویر سے ـ بہ شکریہ بیگم زہرہ انصاری)

جلد ۱۷	اگست ۱۹۵۸ء
نمبر ۱	شراون بھادوں شک سمت ۱۸۸۰

سالانہ چندہ :-	ہندوستان میں :-	چھ روپے
	پاکستان میں :-	چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے :-	دس شلنگ یا ایک ڈالر	
فی پرچہ :-	ہندوستان میں :-	۵۰ نئے پیسے
	پاکستان میں :-	آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

تعارف

ڈاکٹر سید محمود	مولانا آزاد مرحوم کے پرانے رفیق کار، مشہور قومی رہنما، ممبر پارلیمنٹ
جناب بخشی غلام محمد	پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر۔
جناب حافظ محمد ابراہیم	وزیر آبپاشی و بجلی، حکومت ہند
مسز ارونا آصف علی	مشہور قوم پسند اور دلی کارپوریشن کی میئر
جناب ہادی، نقادری	استاذ ادبیات عربی و اردو نظام کالج، حیدرآباد
جناب فضا ابن فیضی	خوش گفتار مقبول شاعر۔ (مئو ناتھ بھنجن۔ یوپی)
حضرت ذائق بنگلوری	جنوبی ہند کے کہنہ مشق شاعر
ڈاکٹر ذاکر حسین	صاحب فکر و نظر، مشہور ماہر تعلیم، بہار کے گورنر
پروفیسر ہمایوں کبیر	وزیر سائنسی تحقیقات و امور ثقافت حکومت ہند۔ مولانا آزادؒ سے آپ کا قریبی تعلق رہا
جناب منظور علی تمنا فاروقی	بجنور (یوپی) کے ایک پرانے شاعر
مولانا نیاز فتحپوری	مشہور انشاپرداز، مدیر "نگار" لکھنؤ۔
علامہ جمیل مظہری	کامل فن اور مخلص شاعر۔ پٹنہ کالج (پٹنہ)
مولانا محمد اجمل خاں	مولانا آزاد مرحوم کے معتمد خصوصی علم و ادب کے شیدائی۔ مذہبیات پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔
جناب خواجہ غلام السیدین	سیکرٹری وزارت تعلیم حکومت ہند۔ ممتاز ماہر تعلیم۔
جناب سید سرفراز حسین رضوی خبیر	محلہ نخاس لکھنؤ۔
جناب ظفر حسین خاں	فلسفی اور مصنف، بنگلہ نمبر ۹۰۵-۹۰۴، جہانگیر، لکھنؤ۔
جناب بسمل سعیدی ٹونکی	زبان داں اور پختہ کار شاعر۔ فکر و فن میں ممتاز
پروفیسر محمد مجیب	وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) ماہر تعلیم اور تاریخ داں، رکن ادارہ
جناب محمد شفیع الرحمٰن	شعبۂ امور عامہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)
جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی	کہنہ مشق ادیب و شاعر۔ دہلی پبلک ریلیشنز کمیٹی کے چیئرمین۔ رکن ادارہ
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	مشہور صحافی، عربی زبان و ادب کے عالم۔ مولانا آزادؒ کے دیرینہ رفیق
جناب یحییٰ اعظمی	دارالمصنفین، اعظم گڑھ، مشاق اور خوش گفتار شاعر
مولانا غلام رسول مہر	ممتاز صحافی اور بہترین ادیب، مولانا آزاد کے قدیم دوست۔ ماہر غالبیات
جناب روحی الہ آبادی	حلیم انٹر کالج، چمن گنج، کانپور
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	پرنسپل کلکتہ مدرسہ (کلکتہ) عربی اور فارسی کے فاضل، اسلامی علوم کے ماہر اور مصنف
جناب روش صدیقی	صاحب فکر، پختہ کار شاعر۔ پروڈیوسر (اردو) آل انڈیا ریڈیو۔
جناب حافظ علی بہادر خاں	ایڈیٹر "دورِ جدید" (دہلی)، کہنہ مشق صحافی۔ جدوجہد آزادی کے مخلص کارکن۔
جناب شمیم کرہانی	کوچہ میر عاشق۔ دہلی۔ خوش مذاق اور نغز گفتار شاعر
جناب محمد یونس خالدی	ابوالکلام اکادمی، عرب ہاؤس، مولوی گنج لکھنؤ، مولانا آزاد کے پرانے ارادت مند اور ادیب
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	ریڈر (اردو) دہلی یونیورسٹی۔ صاحب فکر ادیب اور نقاد۔ رکن ادارہ
جناب اعجاز صدیقی	خوش فکر شاعر۔ ایڈیٹر "شاعر" قصر الادب، بمبئی
جناب ریاض الرحمٰن شروانی	حبیب منزل علی گڑھ۔ مولانا آزادؒ کے حبیب لبیب حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم کے پوتے۔ نوجوان ادیب
محترمہ حمیدہ سلطان	مشہور ادیبہ۔ انجمن ترقی اردو دہلی کی جنرل سیکرٹری
جناب غلام احمد فرقت	مشہور مزاح نگار۔ معلم اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول۔ دہلی

ملاحظات

بڑی بڑی طاقتوں کی باہمی کشمکش اور ایٹم و ہائیڈروجن بموں کی تیاری نے دنیا میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی ہے اور ہر لمحہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی معمولی سا حادثہ عالم گیر جنگ کا بہانہ نہ بن جائے۔ ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف ایٹمی تجربات نے نسل انسانی کو زبردست خطرے میں ڈال دیا ہے۔ آج بھی ان کے جو مضر اثرات فضائے بسیط پر پڑ رہے ہیں وہ کچھ کم نہیں۔ اور آئندہ کے خطرات کا اندازہ متحدہ اقوام کی پندرہ قومی سائنٹفک کمیٹی کی رپورٹ سے ہو سکتا ہے جس کے بعض اقتباسات غیر سرکاری طور پر شائع کر دئے گئے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر ایٹمی دھماکے ۱۹۵۸ء کے بعد جاری رہے تو ان کی وجہ سے ہر سال کوئی سوا تین لاکھ اشخاص مہلک امراض میں مبتلا ہوتے رہیں گے اور ان امراض کا اثر آئندہ نسلوں پر بھی پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ سابقہ دھماکوں کے اثرات آئندہ نسلوں پر پڑتے رہیں گے۔ اس رپورٹ سے ایٹمی دھماکوں کو روکنے کی ضرورت بالکل واضح ہو گئی ہے اور عام انسانی آبادی کی بقاء اور تحفظ کا تقاضا یہی ہے کہ ان تجربات کو فوراً بند کر دیا جائے۔ روس نے از خود ایٹمی دھماکے روک دئے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کا اصرار ہے کہ پہلے اس امتناع کی پابندی کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے جنیوا میں مغربی اور کمیونسٹ ملکوں کے سائنس دانوں کی گفتگو شروع ہو گئی ہے کہ ایٹمی دھماکوں پر پابندی کی نگرانی کے ذرائع تلاش کئے جائیں۔ اگر نیت صاف ہے تو ذرائع کی تلاش اور سمجھوتے کی صورت کچھ مشکل نہیں۔

لبنان کی خانہ جنگی اور عراق کے حالیہ انقلاب کی وجہ سے مغربی ایشیا میں صورت حال انتہائی نازک ہو گئی ہے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے لبنان کے بارے میں واضح طور پر مشورہ دیا تھا کہ لبنان کا معاملہ اس کا اندرونی معاملہ ہے اور اسے وہیں کے لوگوں کو سلجھانا ہے مگر صدر شمعون نے فوجی امداد کی درخواست کی اور امریکی فوجیں لبنان میں پہنچ گئی ہیں۔ دوسری طرف شاہ حسین کی درخواست پر برطانوی فوجیں اردن میں اتار دی گئیں۔ روس نے اس طرح فوجیں بھیجنے کو جارحانہ کارروائی اور بیرونی مداخلت قرار دیا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ اپنے سرحدی علاقوں میں فوجی مشقیں شروع کر دی ہیں۔ ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب قومیت کا سیلاب بڑھتا جا رہا ہے تو اس میں بیرونی مداخلت نہ صرف مغربی ایشیا کو میدانِ کارزار بنائے گی بلکہ امنِ عالم بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہمارے ملک میں بڑے بڑے دریا ہیں اور یہ قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں بشرطیکہ انہیں قابو میں کر کے ان کے پانی سے کام لیا جائے۔ چنانچہ ملک بھر میں جگہ جگہ ان دریاؤں پر بڑے بڑے بند باندھے جا رہے ہیں تاکہ ان کے پانی سے زمینوں کو گلزار بنایا جائے اور بجلی پیدا کر کے کارخانوں کا جال بچھا دیا جائے۔ ان میں سے ایک بہت بڑا بند بھاکڑا بند ہے جہاں دریائے ستلج کو روک کر ایک بریج بنایا گیا ہے۔ پانی کا یہ ذخیرہ ۶۴ مربع میل جھیل کی شکل میں ہے جو دنیا کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل ہے جس سے نہریں نکالی جائیں گی۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ یکم جولائی کو وزیر داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت کے ہاتھوں ستلج بریج کے سرہند فیڈر کا افتتاح ہوا۔ اس فیڈر کی مجموعی لمبائی ۹۲ میل ہوگی جس سے پنجاب میں دس لاکھ ایکڑ اراضی اور راجستھان میں سات لاکھ ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے میں مدد ملے گی۔

"ابوالکلام نمبر" ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس شمارے کی ترتیب و تدوین میں بڑی محنت کی گئی ہے۔ ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ یہ نمبر اس عظیم شخصیت کے شایانِ شان ہو۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ نامور انشاپردازوں اور مولانا آزاد کے رفیقوں نے ہماری بڑی ہمت افزائی کی اور مولانا کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں قابلِ قدر مضامین عنایت فرمائے۔ مولانا جس ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اس کے تمام تر پہلوؤں کا ایک شمارے میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی زیرِ نظر مضامین مولانا کی زندگی، ان کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات اور افکار و خیالات کے بہت کچھ آئینہ دار ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس نمبر کے بارے میں اپنی رائے سے ادارے کو مطلع فرمائیں گے۔

اس سال ہم نے سالنامہ کے علاوہ تین خصوصی نمبر نکالے۔ جن میں موضوعاتی مضامین ہی شامل کئے گئے اور دیگر مضامین جمع ہوتے گئے۔ چنانچہ ہمارے پاس منظور شدہ مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جس میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے مضمون نگار حضرات ابھی کچھ دن مضامین بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اظہارِ عقیدت

ڈاکٹر سید محمود ایم پی

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ ماہنامہ "آج کل" کا آزاد نمبر نکال رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات باصفات اور شخصیت بابرکت کا تذکرہ اب ہماری قومی اور ملی زندگی کا لاینفک جزو ہو گیا اور ہمیشہ رہے گا۔ اس سے ہزار پہلو اور بصد رنگ ہم حوصلہ پائیں گے، روشنی حاصل کریں گے اور یقیناً آیندہ کی ہماری ہر نسل کو اس سے سبق ملے گا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم ہمارے احساس و تاثر میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور تا قیامت بقدر "آج" ہوتے رہیں گے اور "کل" آتے رہیں گے۔ اُن میں اُن کی زندگی کے نقوش ہمیشہ اُبھرتے رہیں گے۔ مولانا ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور ہم اس محرومیت کی تھوڑی بہت تلافی بس اب اسی طرح کر سکتے ہیں کہ ان نقوش کو سنوارتے رہیں اور ہر پہلو و ہر حال سنواریں۔

مولانا کی موت سے پورے ملک و قوم نے جو کچھ کھویا اُس کے احساس کی چبھن کے ساتھ ذاتی رنج و صدمہ کی شدت نے شعور کو نڈھال کر دیا ہے ورنہ اُن کی ذات سے جو مجھے شغف رہا اور باون سال تک جو اُن سے نیاز خصوصی حاصل رہا، اس کی ایک الگ داستان مرتب کرنے کے لیے اگر فرصت لمحات مل بھی جائیں، کئی کتابوں کے جز پورے کرنے کی ہمت بھی ہو جائے تو بھی مستعدیٔ دل و دماغ کہاں سے لاؤں گا؟ اس تمام عرصہ میں اُن سے خلوت و جلوت میں جو ملاقاتیں رہیں اور اُن سے جو برکات و فوائد مجھے حاصل ہوئے اُن کو کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اپنی واقفیت اور اپنے تجربہ کی بنا پر بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم جیسا فاضل اجل، ذہین، طباع اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والا اس وقت اسلامی دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی نے اسلامی دنیا میں دو بڑے مجاہد اور فاضل پیدا کئے، یعنی جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ، مولانا مرحوم ان دونوں کے نچوڑ تھے۔ اس سے زیادہ ان کے متعلق میں کیا کہوں۔

اب ان کے گذرنے کے بعد مجھے تنہائی کے لمحات میں شدت سے احساس ہوتا ہے کہ احمد نگر جیل میں مولانا جو یہ شعر

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار است
گوئی ثمر پیشتر از باغ وجودم

گنگنایا کرتے تھے وہ حقیقتاً شعر نہیں بلکہ اپنی زندگی، اپنی ہستی، اور اپنی ہی بات کو زیر لب دہراتے تھے۔ آنے والی تاریخ کا ایک لمحہ بھی اس سے منکر نہ ہو سکے گا کہ مولانا ایک ایسے انسانی پیکر تھے جس میں ایک سمت علم و فکر کی ایک وسیع دنیا آباد تھی تو دوسری سمتِ اخلاق و انسانیت کی وہ بلندیاں موجود تھیں جہاں وہ تنہا تھے اور اُن کا کوئی حریف نہ تھا۔

مجھے مولانا سے پہلی بار سنہ ۱۹۰۶ء کے آخری مہینوں میں علامہ عبداللہ عمادی جو عربی ادب کے فاضل اجل تھے کے ساتھ لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میری عمر اُس وقت سولہ سترہ سال کی تھی اور مولانا غالباً اُس وقت ۱۸ سال کے تھے۔ قبول صورت نہیں بلکہ نہایت حسین شکل تھی اور پوشاک کی تراش خراش و ہر انداز سے ٹپکتی نفاست سے وہ بالکل الف لیلیٰ کی کسی داستان کے جیتے جاگتے شاہزادے معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے سب سے زیادہ اُن کے طرز گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا جو خطیبانہ مگر تیز رو تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا دریا بہہ رہا ہے۔ علامہ عمادی اور اُن کے درمیان حماسہ، متنبی وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اُن کے حافظ کا

کمال یہ تھا کہ چھتیس سال بعد جب ۱۹۴۲ء میں قید فرہنگ میں احمد نگر جیل ہماری قسمتوں کا آماجگاہ بنا تو انھوں نے اُس پہلی ملاقات کے درمیان کی ساری گفتگو کا موضوع اور تمام تر تفصیلات مجھ سے دہرائیں، کمال حیرت کہ صرف وہی ملاقات نہیں بلکہ بعد کے بھی دوسرے واقعات اور لمحات کی یادیں جو میرے ذہن سے یکسر محو ہو چکی تھیں اُن کو ہمیشہ اس طرح یاد رہیں کہ جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔ اب جیسے ۱۹۱۲ء کی بات کہ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تو دیگر حضرات کے ہمراہ میرے کمرے پر تشریف لائے۔ اس صحبت کی باتیں میں بھول گیا تھا۔ لیکن ان کے حافظے نے وہ سب محفوظ کر رکھا تھا۔

فنِ خطابت کے اس تاجدار کے بارے میں بہت کچھ دہرایا جا چکا ہے لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ دو تین موقعے ایسے اُبھرتے ہیں جہاں میں نے انھیں اپنے الفاظ سے مجمع کے ذہنی دھارے کو اتنی آسانی سے موڑتے دیکھا کہ شاید کسی جادوگر سے بھی ممکن نہ ہوتا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب کہ جنگ بلقان کی گرما گرمی تھی۔ لکھنؤ میں مسلم یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سوال پیش تھا کہ مسلم یونی ورسٹی گورنمنٹ کی شرائط پر منظور کی جائے کہ نہیں۔ اُس وقت الہلال کی دھوم تھی اور جب مولانا آزاد قیصر باغ کی بارہ دری میں آئے تو جلسہ میں پرو دوڑ گئی اور ہر طرف سے مولانا کی تقریر کے لئے تقاضا ہوا اگرچہ لوگ حکومت کے اشارے پر یونی ورسٹی منظور کر لینا چاہتے تھے اُن کی خواہش نہ تھی کہ مولانا آزاد تقریر کریں لیکن مولانا کو اسٹیج پر جگہ دینی ہی پڑی اور اُن کی تقریر نے آن کی آن میں ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اور یہی رائے پاس ہوئی کہ اُن شرائط پر یونی ورسٹی منظور نہ کی جائے۔ مولانا حق بات کہنے میں اس قدر بے باک اور نڈر تھے کہ انھوں نے کبھی وقت و جگہ کی بندش تسلیم نہ کی۔ جنگ بلقان کے متعلق ایک پبلک جلسہ تھا جس کی صدارت نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والیٔ رام پور فرما رہے تھے۔ جلسہ کا مقصد ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ مولانا آزاد جیسے ہی جلسہ میں تشریف لائے مجمع "البلاغ" "الہلال" کہہ کر چلا اٹھا۔ انھوں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی جس سے نواب صاحب دم بخود جلسہ کی صدارت کرتے رہے۔

میرے اور مولانا کے ذاتی تعلقات ۱۹۱۲ء ہی سے بتدریج پختہ تر ہوتے ہوگئے اور میں جب کبھی کلکتہ جاتا تو انھیں کے یہاں قیام کرتا تھا۔ اُن کی غیرت اور خودداری فطرت کو بار بار نزدیک سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں نے کبھی اپنی خودداری کو مجروح نہیں کیا۔ ایسے مواقع بھی اُن کی زندگی میں آئے کہ انھیں سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن دستِ سوال کبھی کسی کے سامنے نہ پھیلایا اور اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ جب وہ رانچی میں تھے تو اُن کو گورنمنٹ سے نظربندی الاؤنس بہت کم ملتا تھا اور وہ بھی سارے کا سارا کتابوں کی خریداری میں ختم ہو جاتا۔ تکلیف و عسرت کی زندگی تھی پر کبھی زبان پر اُف نہ آنے دی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری نے بہت منت و سماجت اور اصرار کے ساتھ کچھ مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ انفاد وضع داری کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ضبط کا یہ عالم تھا کہ شاذ و نادر ہی کبھی انھیں غصہ آیا ہو۔ ہر مسئلہ پر بے حد ٹھنڈے دل سے سوچنے کے عادی تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی اپنی بُرائی کرنے والوں کو بھی بُرا نہ کہتے تھے اگر ایسے شخص کی کوئی اُن کے سامنے بُرائی کرتا تو وہ اُس کی کوئی اچھائی بیان کرتے یا تعریف کر دیتے تھے۔ صابر اس درجہ تھے کہ کسی حال میں بھی اور کسی موقع پر بھی انھوں نے اپنے سخت سے سخت معترضین کا بھی کبھی جواب نہ دیا۔ تقسیم سے پہلے لیگی حضرات و لیڈران نے اُن کی کیا کچھ تضحیک نہ کی مگر اُس نیک دل نے نہ اُس وقت کسی پبلک اسٹیج سے اور نہ تنہائی میں اُن کی شکایت کی اور نہ وہ اُن کے بارے میں کبھی کوئی خاص لفظ زبان پر لائے اور نہ بعد میں جب دو قومی نظریئے کی ہلاکت کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔ انھوں نے کبھی طعنے یا شکوے کرکے بدلہ چکانے کی سوچی بلکہ ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ کے مسلم کنونشن کے اسٹیج پر جب وہ تشریف لائے تو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا آزاد اب مسلم لیگ کو بُرا بھلا کہیں گے۔ اُس کے لیڈروں کی پولیں کھولیں گے اور اُن کی پالیسی کی دھجیاں اڑائیں گے۔ مگر اُن کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ "میں یہاں کسی کو ملامت کرنے نہیں آیا ہوں جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کو آئندہ کی فکر کرنی ہے" کون تھا جو اس بلند اخلاق اور حسنِ کردار سے متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ مسلمانوں کی گذشتہ مصیبت رساں سیاست کا جب آپس میں کبھی ذکر آیا تو یا خاموش رہ گئے یا اگر کچھ کہا تو صرف یہ کہا کہ "اپنے سینے کا داغ کس کو دکھاؤں؟"

اگر میں مولانا کی شخصیت اور تمام زندگی کو ایک جملے میں بیان کرنے پر مجبور ہوں تو یہی کہوں گا کہ وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے اور اُن کی زندگی ایک فرشتہ کی زندگی تھی۔

اس عظیم شخصیت کے لئے چند الفاظ تو کیا کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی لیکن فی الوقت بس اتنا کافی ہے کہ اُن کی سیاسی، ادبی، مذہبی خدمات ہمیشہ صفحۂ ہستی

پر ثبت رہیں گی۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

بخشی غلام محمد پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور ان کی تعلیمات ہماری عظیم قومی ثقافتی اور ادبی میراث ہے۔ اس لئے مولانا کی یاد تازہ کرنا ایک اہم قومی اور ادبی فریضہ ہے اس سلسلے میں آج کل کا "ابوالکلام نمبر" ایک مبارک قدم ہے امید ہے کہ رسالہ مولانا کی زندگی اور فکر و عمل کے مختلف پہلوؤں اور چھپے ہوئے گوشوں کو اجاگر کر کے تشنہ کاموں کی تشنگی کو دور کر سکے گا۔

مولانا کو کشمیر سے خاص شغف اور لگاؤ تھا۔ یہ رشتۂ اخلاص و محبت صرف ان کے ذوقِ جمال کا ہی رہینِ منت نہ تھا۔ دوستی اور یگانگت کا یہ علاقہ سیاسی عقائد و اعمال سے زیادہ تر متعلق تھا۔ سیاسی میدان میں مولانا نے متحدہ قومیت بھائی چارہ، تعمیر اور امن کی راہ اختیار کی تھی۔ کشمیری عوام کا بھی یہی محبوب منزل مقصود رہا ہے باشندگانِ ریاست اس دشوار گزار، کٹھن مگر قومی فلاح کے راستے پر کڑی سے کڑی آزمائش اور امتحان میں اسی طرح ایک زبردست عزم غیر متزلزل یقین اور پورے اعتقاد کے ساتھ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ڈٹے رہے۔ جس طرح مولانا نے اپنی ساری زندگانی میں زمانے کی ہولناک چیرہ دستیوں اور ہر کبھی کی کج روی اور ستم رانیوں کے درمیان انسانیت کی سربلندی اور سرخروئی کے لئے فرقہ پرستی، تعصب، جہالت، حرص و آز کی، باطل قوتوں سے زبردست قوتِ ارادی، محکم ایمان اور بے پناہ جوشِ عمل کے ساتھ لڑتے رہے یہ اُن ہی اصولوں اور آدرشوں کی یکسانیت اور یگانگی کی کرشمہ سازی ہے کہ آج کشمیر ہند کے رشتۂ اشتراک میں ایسے بندھا ہے کہ توڑنے سے ٹوٹ نہ پائے گا اور کشمیری عوام ہند کے دوسرے حصوں میں رہنے والے اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ تعمیر، امن اور فلاحِ عامہ کے لئے سرزمینِ ہند پر ایک تاریخی اور یادگار جنگ لڑ رہے ہیں۔ آج اگرچہ مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمات اور اصول ہمیں پنڈت نہرو کی قیادت میں ایک ایسا سوشلسٹ سماج تعمیر کرنے پر اُبھار رہے ہیں۔ جس میں بلا امتیازِ مذہب و ملت، رنگ و نسل ہند میں رہنے والے سبھی لوگوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع اور سہولیات کی ضمانت دی گئی ہے۔

الغرض مولانا میدانِ سیاست کے شہسوار اور ہماری جدید تاریخ کے ایک ہیرو ہی نہ تھے۔ آپ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں ایک اولوالعزم قومی رہنما بھی تھے، زبردست فلسفی بھی تھے، جادو بیان خطیب بھی تھے۔ صاحبِ طرز ادیب بھی تھے، بیدار عالمِ دین بھی تھے، اور منجھے و کھلے ہوئے مدبر اور ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ قصہ کوتاہ مولانا کی ایک ہی زندگی میں بیک وقت کئی زندگیاں جمع ہو گئی تھیں۔ متضاد اور بٹی ہوئی حیثیتوں کی یہ جامع زندگی ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کا ایک حسین اور دل نواز امتزاج تھی۔ جو ہماری قومی سماجی اور ثقافتی زندگی کا حاصل ہے۔ اس حیثیت سے مولانا کی زندگی ہمارا ایک قابلِ قدر ورثہ ہے۔ وہ ورثہ جسے ہم سینے سے لگا کر اپنی اور اپنی نئی پود کی زندگیوں کو خوش آیند اور تابناک مستقبل کی لازوال خوشیوں اور مسرتوں سے مالامال کر سکتے ہیں۔

میں اس پیغام کی وساطت سے ہند کے قومی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور عوام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم ہندوستان کی برفیلی پیشانی۔ کشمیر میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کی نورانی مشعل کو اسی طرح فروزاں رکھیں گے جس طرح اب تک روشن رکھے ہوئے ہیں۔

کامیابی کے لئے دعائیں

حافظ محمد ابراہیم وزیرِ آبپاشی و بجلی

مولانا مرحوم کی نسبت میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مولانا کے پاس سب سے بڑی چیز علمیت تھی۔ اس کی نسبت مجھ جیسا جاہل کچھ ہی کیا سکتا ہے پھر بھی اتنا ضرور عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں، کہ اُن جیسا اس زمانے میں کوئی اور نہیں تھا۔ اور زمانہ مدتوں اب ایسا کوئی اور پیدا نہیں کر سکے گا۔ نہ معلوم دنیا کو کب تک انتظار کرنا ہوگا۔

دنیا میں بے مثال عالم ہونے کے علاوہ مولانا محبِ وطن اور بہت بڑے درجہ کے محبِ وطن تھے۔ کانگریس اور ملک کی خدمات جو مولانا نے انجام دیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہوں گی جس کو پڑھ کر ہماری آیندہ نسلیں فخر و مباہات کے ساتھ مرحوم کو یاد کریں گی اور ان کی سیرتوں میں اس یاد سے ایک علو اور بلند حوصلگی پیدا ہوگی۔ باوجود وفات مولانا ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

مولانا ابوالکلام زندہ باد

مسز ارونا آصف علی میئر دلی کارپوریشن

مولانا آزاد کی عظمت کا چند لفظوں میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی گوناگوں اور درخشاں شخصیت علما اور عوام دونوں ہی کے لئے سرچشمۂ فیض تھی۔ جن کسی کو انھیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اس کے لئے یہ ایک بھرپور تجربہ ثابت ہوا۔

مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے شاید سب سے زیادہ فصیح بیان وکیل تھے لیکن جن لوگوں نے ہندوستانی قومیت کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں، ان کے لئے بھی مولانا کے دل میں انتہائی خیر و فکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ مولانا آزاد ہماری تاریخ میں ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کے نقیبوں میں شمار کئے جائیں گے جو قومی خدمات کے لئے گویا ایک موسم بہار تھا اور جس نے ملک والوں کو بیدار اور تر و تازہ کیا۔

ان کی تحریروں میں نہ صرف ہمہ گیریت ہے جس نے انھیں ادب عالیہ بنایا ہے بلکہ ان میں والہانہ ادبی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تحریریں کئی نسلوں تک اردو کی تاریخ کو متاثر کرتی رہیں گی۔ ہمارے زمانے کا مورخ اگر مولانا آزاد کی زندگی کا بغور مطالعہ کرے گا تو اس کا کام آسان ہو جائے گا۔

گاندھی، نہرو اور آزاد یہ تینوں شخصیتیں ہندوستانیوں کی دو نسلوں کے خیال و عمل پر پوری طرح چھائی رہی ہیں۔ ان تینوں شخصیتوں کی قوتِ تاثیر اس بات میں مضمر ہے کہ یہ عقل و کردار کے تین عجیب و غریب رجحانات کا ہم آہنگ امتزاج تھا۔

مولانا آزاد کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پُر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم ان کی عظمت اور ذہانت کے ورثے کو برقرار رکھ سکے تو وہ برابر آیندہ نسلوں کو متاثر کرتے رہیں گے۔

ہادی القادری

تاریخِ انتقالِ ابوالکلام آزاد از ہادی

۱۹ ۵ ۸

ہوئے جو حضرتِ آزاد زیست سے آزاد — بپا ہے قصرِ حکومت میں نالہ و فریاد

وہ جن کو فکر ہو تاریخ سالِ رحلت کی — انھیں یہ چاہیئے رکھیں یہ شعرِ ہادی یاد

وزیرِ دانش و دانش در و ادیبِ شہیر

۱۱۸۳

مجاہدِ وطن، آزاد، ابوالکلام آزاد

۷۷۵ + ۱۱۸۳ = ۱۹۵۸

دفورِ جذبۂ دل اور شدّتِ احساس — بیان کر نہیں سکتا ہے نطقِ انسانی

کوئی بتاؤ تو کیا بات ہے کہ کرنے لگی — زبانِ کلکِ جگر بارِ اشک افشانی

یہ کون اُٹھ کے گیا ہے کہ بزمِ اُردو میں — ہوئی ہے رنج و غم و درد کی فراوانی

ملی ہے خوب یہ تاریخِ سالِ فصلی بھی

ابوالکلام خطیب و ادیب لاثانی

۱۳ ف ۶۷

وہ جو تھے سب ابوالکلام کہیں — ایسے اچھے خطیب سے رخصت

عقل کرتی تھی جس سے استدلال[1] — ہند کے اس لبیب سے رخصت

دوستوں کے قلوب جانتے ہیں — ہے قیامت حبیب سے رخصت

کوئی پوچھے اگر سنہ ہجری

کہہ ہادی "ادیب سے رخصت"

۱۳۷۷

[1] استدلال سے عقلوں نے روشنی حاصل کی ہے

گرہ کشائے زمانہ تھا تیرا ناخنِ ہوش
جنوں ملا تھا بڑا عہد آفریں تجھ کو

تری نگاہ سے اسرارِ شوق کب چھپتے
عطا ہوئی تھی نگاہِ کرشمہ بیں تجھ کو

ہوائے منزلِ جاناں کب آئی راس تجھے
قرار مل نہ سکا ایک پل کہیں تجھ کو

بلند تر تھی ترے ذوق و کیف کی دنیا
کہ جامِ زہر بھی تھا جامِ انگبیں تجھ کو

نچوڑ تھا کئی صدیوں کا شخصیت تیری
بھلا سکے گی نہ یہ خاکِ عنبریں تجھ کو

نہ رہ سکا قفسِ رنگ و بو میں قید اگر تو
ازل سے فطرتِ آزاد لے کے آیا تھا

اتر گئی جو رگِ گل میں بن کے خون کی بوند
وہ موجِ نکہتِ برباد لے کے آیا تھا

کسے خبر تھی تو ہنستی ہوئی نگاہوں میں
فسانۂ دلِ ناشاد لے کے آیا تھا

غزل سرا رہا ہر دور میں جنوں تیرا
غلط کہ تو لبِ فریاد لے کے آیا تھا

ترے لبوں پہ دمِ واپسیں تھا کس کا نام
تو دل میں کس کی حسیں یاد لے کے آیا تھا

ذائق بنگلوری

قطعۂ تاریخ بر وفات امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

عالمِ جید، فقید المثل، دانائے علوم
زیں سرائے ششدری نقلِ مکاں فرمودہ است

سرفروشِ ملک و ملت شہسوارِ حریت
بست رختِ زیست راہِ آخرت پیمودہ است

روزِ شنبہ بود بست و دو میں از فروری
طائرِ جانش پرِ پرواز را بکشودہ است

زاد بودش بود مکہ شصت و نہ سالہ حیات
درکنارِ خاکِ دہلی آخرش آسودہ است

سالِ ترحیلش، مکرر گفت ذائق عیسوی

مشرقستاں از امام الہند خالی بودہ است

۱۹ ۵۵

ڈاکٹر ذاکر حسین

ابوالکلام آزاد - ایک ہمہ گیر شخصیت

یہ تقریر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دلی کے اس تعزیتی جلسے میں فرمائی تھی جو صدر جمہوریہ
ڈاکٹر راجندر پرشاد کی زیر صدارت ۲۳-فروری ۱۹۵۸ء کو منعقد ہوا تھا۔

ماننیہ پتی جی، بھائیو اور بہنو! آپ جانتے ہیں کہ ہم آج کیوں یہاں جمع ہیں۔ یہاں تک آپ کے سامنے جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کے ساتھیوں کی عقیدت کا اظہار تھا۔ میں مولانا کے ساتھی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں۔ میں تو ان کے ایک حقیر چیلے ہونے کا فخر رکھتا ہوں۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا اپنی زندگی بنانے کے لئے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے۔ میں جب ایک لڑکا ہی تھا اپنی زندگی کے مٹی کے دیئے کو سلگانا چاہتا تھا۔ اور لوگوں کی طرح میں نے بھی روئی کی بتیاں بنائی تھیں۔ اور اپنی زندگی کے تیل میں ان کو ڈالا تھا اور ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے جلاؤں۔ اس زندگی کی پہلی بتی، اس دیئے کی پہلی بتی میں نے مولانا کے دیئے سے جلائی تھی۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان کا "الہلال" پڑھتا تھا اور جب میں اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اس کو پڑھتا تھا اور انھیں سناتا تھا اس وقت اس بتی میں آگ لگی تھی۔ یوں اور جگہ سے بھی میں نے آگ لی۔ لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں پہلی آگ انھیں سے لی تھی۔ میں ان سے دور دور رہتا تھا اس لئے کہ میں سیاست کا آدمی نہیں ہوں۔ ہر وقت ان کے ساتھ کا موقع مجھ کو نہیں تھا کبھی ان سے ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو ان سے روشنی اور گرمی پاتا تھا۔

دو سال [illegible] کچھ عرصہ ہوا کہ ایک بات میں مجھے ان سے کچھ رنج ہوا اور میں ان سے کھنچا۔ اس وقت آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے اس کھنچاوٹ کو ان پر ظاہر بھی کیا مگر اس کو وہ وقار نے، بجائے اس کے کہ اسے میری گستاخی سمجھے مجھ پر محبت کی بھرمار کی اور جب میں ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تو میں شرم سے گڑا جاتا تھا اور وہ محبت سے اُبلے جاتے تھے اور میرے اوپر شفقت کی ایسی بارش تھی کہ میں اس کو کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ مولانا بہت سی حیثیتیں رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے مذہب کے، بہت بڑے عالم تھے ادب کے، ادب پر، لٹریچر پر بڑی نظر رکھتے تھے۔ بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ کتابوں پر عاشق تھے اور کوئی سیاست دان یہ نہ سمجھے کہ انھوں نے سیاست کی خاطر اپنے علم کو کبھی بھی چھوڑا ہو۔ وہ آخر لمحے تک اس کے ساتھ وفادار رہے۔ ہاں وہ یہ جانتے تھے کہ علم ایک بار بھی ہو سکتا ہے، علم ایک ایسا بوجھ ہو سکتا ہے جو آدمی کو دبا دے اور اس کو ناکارہ کر دے۔ وہ علم کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے تھے۔ وہ اپنے وطن کے فرائض کو بھی جانتے تھے۔ انھوں نے آخر وقت تک علم کو نہیں چھوڑا اور علم کی لگن ان کے دل میں لگی رہی۔ کتابوں کی تلاش، چیزوں پر غور و فکر، ان کو سوچنا، ان کو سمجھنا، ان کے جوڑ ملانا، چاہے وہ تاریخی مسائل ہوں، چاہے وہ ادبی مسائل ہوں، چاہے وہ علمی مسائل ہوں، ان کا یہ شغل آخر تک باقی رہا۔ ابھی آخری مرتبہ دسمبر میں جب میں ان سے ملا تو وہ دو کتابیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کتابوں کے دیکھنے کے لئے پٹنے آنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ گوہاٹی کے سفر میں پٹنے آؤں گا اور وہ دو کتابیں دیکھوں گا۔ افسوس کہ

اس کا موقع ان کو نہیں ملا۔ علالت کی وجہ سے نہ وہ کانگریس میں گئے اور نہ اسمبلی میں بیٹھ سکے لیکن ان کی یہ لگن آخری وقت تک رہی۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ایسے عالم تھے کہ علم کے بہانے سے اپنے تمام سماجی فرائض سے الگ ہو جاتے اور سماجی فرائض کا خیال نہ کرتے۔ انھوں نے اپنی مثال سے یہ بتا دیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک مجاہد کی طرح اپنی قوم کی آزادی کے لئے، اس کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اور آزادی حاصل ہونے کے بعد آزادی کو اچھی نیو اور بنیاد پر قائم کرنے کے لئے صرف کر سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھندا نہیں ہے کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دئے جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عالم، اس مفکر، اس مرد مجاہد نے کلمۂ حق کہنے، سچی بات کہنے، ناگوار سچی بات کہنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ سچ بات کا کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ سچ بات کہنے میں بڑی ناگواریاں ہیں۔ لوگ ناخوش ہوتے ہیں اور مولانا سے لوگ کیا ناخوش نہیں ہوئے۔ یہاں مسلمان بھائی ہوں گے۔ ہم سوچیں کہ ہم نے مولانا کا کس کس طرح دل نہیں دکھایا۔ ہم نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔ کون سا بُرا لفظ ہے جو ہم نے ان کے لئے استعمال نہیں کیا لیکن اس وقار کے پتلے نے کبھی ایک لفظ کہا کسی کے متعلق؟ کوئی ہے یہاں جو یہ شہادت دے سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی کی بات کوئی ایسا کلمہ سنا کہ انھوں نے شکایت کی ہو یا بُرا مانا ہو۔ سب کچھ گزر جاتا تھا اور اس کی وہ بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ کلمۂ حق ضرور کہتے تھے۔ مشورہ لیجئے، صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ وہ کم آمیز تھے۔ کچھ عرصے سے زیادہ کم آمیز ہو گئے تھے۔ لوگوں سے کم ملتے تھے لیکن وہ سب کے ساتھی تھے۔ وہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہمارے سب کے ساتھی تھے۔ اور اس طرح ساتھی کہ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ بات کہنے کی ضرورت ہوتی تھی جو ہم چاہتے ہیں کہ کہی جائے اور جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اور ہماری طرف سے نہیں کی جا رہی ہے وہ اس کو کہتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ اس کو کہہ سکتے ہیں اور ایک مرد مجاہد کے واسطے یہ بہت بڑا مرتبہ ہے۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑی عبرتیں ہیں۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑے سبق ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا چونکہ میں ایک طالب علم کی طرح سبق لینے کے لئے ہی ان کے پاس گیا تھا۔ آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ وہ سبق جاری ہے۔ اگرچہ وہ ہم میں نہیں رہے۔ جیسا کہ راشٹرپتی جی نے کہا کہ وہ قلم جس سے موتی برستے تھے، وہ قلم جس سے بجلیاں بھی گرتی تھیں، وہ زبان جس سے پھول برستے تھے اور جس سے چنگاریاں بھی برستی تھیں، جو باطل کو جلاتی بھی تھی اور سچ کو روشنی بھی کرتی تھی۔ وہ زبان بند ہے وہ قلم ٹوٹ گیا ہے لیکن وہ مثال باقی ہے اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اس مثال سے گرمی بھی لیں اور روشنی بھی لیں اور اپنی زندگی کو ایسا بنائیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم بنائیں اور جس کی مثال وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس قوم کے بنانے کا کام کوئی کھیل نہیں ہے۔

بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہتھیلی کے اوپر سرسوں جم سکتی ہے۔ اس میں نہ معلوم کتنے ابوالکلام کھپ جائیں گے، کتنی نسلیں کھپ جائیں گی اور یہ کام کبھی ختم نہ ہونے والا کام ہے۔

اس لئے ہمیں اپنے سامنے اس راستے کو رکھنا چاہیئے۔ ان مثالوں کو زندہ رکھنا چاہیئے۔ وہ اس طرح زندہ رہ سکتی ہیں کہ ہم وہ کریں جو وہ کرتے رہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم وہ نہیں کر سکتے ہیں جو وہ کرتے تھے۔ کسی کی جگہ پُر نہیں کی جا سکتی۔ بہت بڑے بڑے لوگ گزر گئے۔ جیسا کہ کسی نے ابھی حال میں کہا تھا کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آسمان پر بہت سے ستارے ایک ساتھ آ جاتے ہیں۔ ہمارے قومی آسمان پر بھی بہت سے ستارے ایک ساتھ آ گئے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے جاتے ہیں۔ لیکن اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ پروا کر کے کچھ ہو نہیں سکتا۔ ان کا جانا ضروری ہے، برحق ہے۔ کوئی ان کو واپس نہیں لا سکتا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کسی ترکیب سے ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جو کام ایک آدمی کرتا تھا وہ ایک ہزار آدمی مل کر کریں۔ لیکن اپنی زندگی کا رُخ وہی رکھیں۔ سچائی کی طرف رکھیں، عمل کی طرف رکھیں، علم کی طرف رکھیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ جانیں کہ ہمارے اوپر جو فرائض ہیں وہ پوری طرح ادا کئے جانے کے لئے روز مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ فرائض کبھی ختم نہیں ہوتے۔

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو انھوں نے یہ جتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو تفرقہ پیدا کرتی ہے، ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے۔ جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب جو سچا مذہب ہے انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے، مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے، مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لئے اپنے کو مٹانے کی روح ہے، مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے، ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام اُن لوگوں کو سیکھنا چاہیئے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر، صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں اتنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے لیکن اس کو پہلے اپنے دیس کا، پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہیئے۔ تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے، تب وہ سچا عیسائی ہے، تب وہ سچا پارسی ہے تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے جیسا روشن طور پر ہمیں ملتا ہے اور یہ سبق جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ آج کا دن ہمارے لئے اس عہد کرنے کا دن ہے کہ ہم اس روح کو، مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کریں۔

بہار و خزاں

اور امید و بیم

"... اس میں تو شک نہیں کہ جس قدر کاوش سے غور کیجئے گا۔ جذبات انسانی کی تحلیل و تفرید کے آخری عناصر یہی دو چیزیں: امید و حسرت نظر آئیں گی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا آئندہ کی امید ہے یا رفتہ پر حسرت۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ امید و یاس کی تقسیم کو صرف افراد و اشخاص ہی میں محدود نہ کیجئے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ باغ و چمن میں بہار و خزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ اور اپنی اپنی آمد کے تقاضا و حالات کے آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح امید و حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجئے جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں اور وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہے جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے۔ بعض قومیں ہیں جن کے حصے میں امید کی بہار آئی ہے اور بعض ہیں جو صرف یاس و حسرت کے خزاں ہی کے لیے رہ گئی ہیں۔ موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا ہے اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے لے کر درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوش حیات اور ولولۂ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دَورِ امید سے گزرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لئے ایک بہشت امید بن جاتی ہے اور اس کی ہوا ان کے کانوں کے لئے ایک ترانۂ امید کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر کونہ امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروس امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا اس طلسم نا پیدا و نیست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کا ہیولیٰ ہیں۔ جب تک آپ کے دل کے طاق مخفی میں امید کا چراغ روشن ہے۔ اس وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر بادِ صرصرِ نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا تو پھر آفتاب نصف النہار پر درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجئے کہ دنیا کا یہ تمام نظام سر تا پا آپ کے لئے ظلمت سرائے تاریک ہے۔"

('الہلال' ۹۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

ہمایوں کبیر

عہد آفریں شخصیت

کوئی چالیس سال ہوئے جب مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار ہندوستان میں علم وادب اور سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے، لیکن آج تک ان کے ہم وطنوں میں، جن میں ان کے مداح اور ناقد دونوں شامل ہیں، اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ مولانا آزاد ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھے یا بہ حیثیت سیاست داں۔ مولانا آزاد ابھی عنفوانِ شباب کی منزل میں ہی تھے کہ انھوں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' میں آتش نوا مضامین لکھ کر شمالی ہند کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ محض ادبی کاوشوں کے اعتبار سے بھی اردو زبان وادب کی تاریخ میں یہ مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔ خطابت، فصاحت وبلاغت، ذہانت وفطانت، تیکھے طنز اور اعلیٰ وارفع کیفیت کا ایسا امتزاج مشکل سے ہی ملتا ہے۔ 'الہلال' کے اداریوں میں مضمون نگاری کے جو نمونے پیش کئے گئے انھوں نے اردو نثر میں ایک نئے اسلوبِ نگارش کی بنیاد ڈالی۔

مگر اس وقت کے نوجوانوں کے دماغ جس چیز سے متاثر ہوئے وہ مولانا آزاد کے مضامین کی صرف ادبی فوقیت یا شاعرانہ حسن نہیں تھا۔ برطانوی اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی جدوجہد کے ناکام ہو جانے کے بعد سے ہندوستانی مسلمان مایوسی اور عدم اعتماد کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سرسید احمد نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت سدھارنے کے لئے اس طریقے پر کوشش کی کہ فاتحوں کی حمایت حاصل کی جائے اور مسلمانوں کو عملی سیاست سے دور رکھا جائے۔ سیاست سے گریز بالآخر سیاست کی مخالفت ہو کر رہ گیا۔ ایسی منفی پالیسی بذاتِ خود بُری پالیسی تھی۔ پھر اس وقت کے حالات کی وجہ سے یہ پالیسی ملک اور قوم کے لئے زبردست خطرے کا باعث ہو گئی۔ مسلمانوں کی سیاست سے الگ ہونے کی کوشش ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے مدمقابل تھی۔ جو اب سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے لگے تھے۔ سرسید کی ہندوؤں سے دوستی اور قدر ومنزلت کے باوجود ان کی سیاست نے بالآخر ایک پلٹا کھایا۔ ان کی پالیسی جو کہ سیاست کے خلاف تھی ان کے جانشینوں کے ہاتھ میں ہندوؤں کے خلاف آلۂ کار بن کر رہ گئی۔

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کی منظور شدہ پالیسی یہی تھی۔ اس وقت نیم سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سرسید کی پالیسی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک سے پورا پورا اتحاد اور تعاون کیا جائے اور برطانوی شہنشاہیت کی طاقتوں کی پُرزور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل لوگوں کو بڑا دھکا لگا اور پھر سرکردہ مسلم سیاستدانوں کے بعض حلقے ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں کی اکثریت کو مولانا آزاد کا یہ موقف ایک سراسر سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "الہلال" ہندوستانی مسلمانوں کے اُبھرتے ہوئے جذبے کے اظہار کا ذریعہ ہو گیا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقی، آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد مذہبی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی پرورش اور تربیت ان کی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چوں کہ

مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی حدیث و فقہ کے ماہر تھے یہی سبب ہے بعض لوگ مصلح اور قوم پرست کی حیثیت سے ان کے رول کو کچھ غیر حقیقی سمجھتے تھے۔ لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انھیں لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انھیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دئے ہیں۔ اسلام نے جس میں جمہوریت، آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے جواں سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ چناں چہ وہ ملک و قوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، خوشامد پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدان کارزار میں لے آیا۔

لیکن سیاسی سرگرمیاں مولانا آزاد کی علمی حیثیت پر کبھی حاوی نہیں ہوسکیں ایک عالم کو زندگی کی مستقل قدروں سے تعلق ہوتا ہے جبکہ سیاست داں عام طور سے وقتی باتوں پر توجہ کرتا ہے۔ مولانا آزاد ڈپلومیٹ یا سیاسی چال باز سے زیادہ ایک بڑے مدبر تھے۔ ان میں دو خصوصیات تھیں جو ان کے تمام سیاسی اعمال کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یعنی ان کی سنجیدگی اور مزاجی توازن اور ان کی سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ اگرچہ وہ ایک شاعر کی طرح بے حد حساس واقع ہوئے تھے لیکن انھوں نے کبھی سیاسی فیصلوں میں اپنے جذبات کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ کسی شخص کے بارے میں ان کی پسند یا ناپسند ان کے فیصلوں میں کبھی آڑے نہیں آئی۔ انھوں نے ہر معاملے کو واقعیت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی اور یہ بات ان کے دوست دشمن دونوں کے لئے تعجب خیز رہی ہے۔ اس مزاجی توازن اور سنجیدگی کی وجہ سے ان کا مشاہدہ بہت صاف تھا۔ جب تک کوئی شخص معقولیت پسند رہتا ہے اور ہر بات کو دلائل کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اس وقت تک اس سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ سیاست میں اور دوسری جگہ بھی غلطیاں اسی وقت ہوتی ہیں جب کہ توازن پر تعصب غالب آجاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہم زیر نظر معاملے کے مختلف پہلوؤں کو پرکھ نہیں پاتے۔ مولانا آزاد کی سنجیدگی اور سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ کی وجہ سے ان کے سیاسی فیصلوں کو ایک طرح کی غیرفانی حیثیت حاصل ہوگئی تھی جس سے دوست مرعوب تھے اور مخالف بدحواس۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیوں گرما گرم مباحثوں میں بھی ان کے منہ سے غصہ یا طیش میں کوئی لفظ نہیں نکلا اور نہ انھوں نے کبھی کسی پر الزام دھرا یہاں تک کہ انھوں نے ان لوگوں کے خلاف بھی کسی غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا جنھوں نے ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا ہر قسم کے طوفانی حوادث اور اختلافات کے درمیان ذرا نہیں گھبرائے۔ اس ضبط و نظم کی وجہ سے وہ ایک بے پناہ شخصیت کے مالک ہوگئے تھے۔ مولانا کی ہمت اور ارادے کی مضبوطی نے ان کے بدترین دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

چونکہ مولانا آزاد کی شخصیت بیک وقت ایسی درخشاں بھی تھی اور رمز آمیز بھی، اس لئے ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو جانا لازمی بات ہے مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی۔ البتہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے جامعہ ازہر گئے تھے۔ ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ مولانا نے بچپن میں ہی ایک عالم کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کرلی تھی۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے ایک مشہور عالم سے کسی موضوع پر ان کی طویل خط و کتابت ہوئی۔ پھر اس عالم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ بالمشافہ گفتگو کر کے بعض مسائل طے کرلئے جائیں چنانچہ جب نوجوان مولانا اس بزرگ عالم کے پاس پہنچے تو انھوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور تپاک سے پوچھا کہ آپ کے باپ کیوں تشریف نہیں لائے آپ کو کیوں بھیج دیا؟ ایک اور کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ کسی جگہ مولانا کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا مگر جب مولانا وہاں پہنچے تو انھیں اندر جانے نہیں دیا گیا کیونکہ کسی کو یہ اعتبار نہیں آسکتا تھا کہ یہ بے ریش لڑکا وہی مشہور عالم ہے جس کا سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔

قدرت اکثر مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے انعامات سے نوازتی ہے کسی کو جسمانی طاقت عطا ہو جاتی ہے تو کسی کو ذہنی قوت۔ قدرت بعض لوگوں کو دھن دولت دیتی ہے تو بعض کو شہرت و عظمت عطا کرتی ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ یہ سارے انعامات ایک ہی شخص کو ملیں۔ مولانا آزاد ان چند خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جنھیں قدرت نے پورے طور پر وہ تمام چیزیں عطا کی تھیں جن کی ہر انسان آرزو کرتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا تھا، جسے انسانی دماغ سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ یہ کہ ان تمام انعامات کے ساتھ انھیں حساس طبیعت بھی عطا ہوئی تھی اور ان کے دل میں انسانوں کے دکھ درد کے لئے ہمدردی بھی تھی۔ چناں چہ اپنی ذاتی کامیابیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے چاروں طرف

اس تند غلطیوں فضولیات اور نفرت کو دیکھ کر بے چین رہتے تھے۔

مولانا آزاد جیسے شخص کے لئے روحانی طور پر ایک طرح کی تنہائی محسوس کرنا لازمی امر تھا۔ جو کوئی ان کے قریب آیا اس نے محسوس کیا کہ مولانا روحانی طور پر تنہا ہیں۔ مولانا آزاد بڑے خلیق تھے اور ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ پھر بھی ان کی دنیا الگ تھلگ تھی جس میں بہت کم لوگوں کا گذر ہو سکتا تھا وہ اپنے خیالات کی دنیا میں رہتے تھے اور اپنی طبع خداداد کے بل بوتے پر دنیا کے دکھ درد کو برداشت کرتے تھے۔ وہ انسانی دکھ درد کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان میں قوتِ برداشت بھی تھی اور انسان کی بنیادی اچھائی پر انہیں پورا اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی تکالیف میں اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ بنیادی طور پر وہ حقیقت پسند تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہر معاملے میں بالآخر منشائے الٰہی پورا ہوتا ہے۔ یہی ان کا ایمان تھا اور یہی اس نسل کے لوگوں کے لئے ان کی وصیت۔

منظور علی تمنا فاروقی بجنوری

قطعہ تاریخ بابت وفاتِ آزاد

۱۹۵۸ء

هزار حیف یکایک ز گلشنِ ایجاد — برفت سوئے جناں شمع بوستانِ آزاد
ز دنیا رفت پیکرِ آزاد، رفت روحِ کبیر — چه شد که حیف جدا شد ز خانہ خانہ زاد
دریغ، رہبرِ مخلص بہ وقتِ نا مسعود — برفت و کرد دلِ دوستاں زغم ناشاد
زعیم عالی ہمم، نیک رائے، خوش تدبیر — کشادہ قلب و نظر، دوربین و دور افتاد
ادیب نکتہ رس و اہلِ علم و صاحبِ فن — کہ بود جنبشِ چشمش پیامِ علم و ارشاد
بہ وا رعقدہ مشکل، ز ناخنِ تدبیر — بہ صد خلوص بہ فکرِ رسا گرفت و کشاد
ہمیں کہ قوم و وطن را ز پنجۂ افرنگ — بہ نسبتی کہ او آزاد بود، کرد آزاد
بہ قولِ فیصل خود مطمئن بہ استقلال — بہ عزم کوہ گراں بار، ہر چہ باد اباد
کسے نہ بود بہ ایماں، میانِ پرگشتن — زباں بہ گفت و گوش آمدہ "بجا ارشاد"
وداں زماں کہ بایں ظلمت احتیاجش بود — ضیائے شمعِ ہدایت، دریغ رفت بہ باد
تمنا، با دلِ غمگین و چشمِ اشک فشاں — سرِ تلاش چو بہ آستانِ فکر نہاد
برائے سالِ وفاتش [illegible]
[illegible] کہ حیف رفت بہ جنت ابوالکلام آزاد

۱۳۷۷ھ

نیاز فتح پوری

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

مولانا آزاد کی تمام ذہنی خصوصیات اور جامعیت فضل و کمال سے ہٹ کر محض ان کی صحافتی عظمت و خصوصیت پر اظہار خیال بہت دشوار ہے۔ مولانا کے صحافتی بدایع کا ذکر کرنا اور اُن تمام عطایائے فطرت کو نظر انداز کر دینا جو قدرت نے ان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کئے تھے ممکن نہیں کیونکہ مولانا کی صحافت عہد حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی۔ اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے ماورائے صحافت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔

مولانا اپنی فطری افتاد، اپنے فکر و تصور، اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے کہ بیک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل و خصائص کا احصار کر سکتے ہیں۔ نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کر سکتے ہیں۔

لارڈ جاسج سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ "صحافی بننے کے لئے ایک انسان کو کیا کیا جاننا چاہیئے؟" انھوں نے جواب دیا "سب کچھ اور کچھ نہیں" یعنی صحافی درا صل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے، لیکن ماہر کسی کا نہ ہو۔ لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیائے صحافت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

مولانا کے فضل و کمال کا تنوع، ان کے مطالعہ کی وسعت ان کا پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور ایک خاص قسم کا عالمانہ رکھ رکھاؤ۔ ان سب کا اتنا دلکش امتزاج ان کے اندر پایا جاتا تھا کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ گویا وہ ایک ایسا کُل تھے جس کا کوئی جزو اس سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے سامنے اگر مختلف رنگ کے پھول علٰحدہ علٰحدہ رکھ دیئے جائیں تو ہم ان کے رنگ و نکہت پر علٰحدہ علٰحدہ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سب کا گلدستہ بنا کر سامنے لایا جائے تو ہم اسے گلدستہ ہی کی حیثیت سے دیکھیں گے اور امتیاز رنگ و نکہت کا کوئی سوال ہمارے سامنے نہ ہوگا۔ بالکل یہی حال مولانا کے ذہنی اکتسابات کے تعدد و تنوع کا تھا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ خواہ وہ شعر و ادب سے متعلق ہوں۔ خواہ مذہب و حکمت سے وابستہ ہوں۔ خواہ صحافت و سیاست سے!

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اُن سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالاں کہ وہ بہت زیادہ وزنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے ان کی تعیین و صراحت آسان نہیں، تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و مطالعہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچہ میں ڈھل کر رہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی و بدیع آزماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر محض علوم حکمیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر

دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم و فیلسوف نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاحِ اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ مسلکِ اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔ واصل بن عطا کا ذکر آیا ہے تو اس کے تبحر علمی کا بھی ایک لطیفہ سن لیجئے۔ یہ پیدائشی توتلا تھا جسے عربی میں الثغ کہتے ہیں۔ رے کا تلفظ وہ صحیح نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہوجاتا تو وہ کوئی لفظ ایسا استعمال ہی نہ کرتا جس میں رے پائی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ اگر تم کو یہ کہنا ہو کہ "وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ تانا" تو کیا کہو گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو یوں ادا کریں گے۔ "رکب علی فرسہ وجر رمحہ" اس میں چار جگہ رے آتی ہے۔ واصل نے کہا کہ میں اسے یوں کہوں گا۔ "استویٰ علی جوادہ و سحب عاملہ" خیر یہ تو ایک دلچسپ بات تھی جس کا ذکر ضمناً آگیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد کو زبان پر اتنا ہی عبور حاصل تھا۔

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جن کو زمانہ نے یا خود اُن کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انھیں صرف الہلال و البلاغ کے رئیس التحریر یا تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر کے مصنف ہونے ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کے حالات زندگی اور ان کے امیال و عواطف سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ورنہ یہ حکایت لذیذ و دراز تر ہو جاتی۔ لیکن اگر ہم محض ان کی صحافتی زندگی سامنے رکھیں تو بھی اس کی بوقلمونی اور بوالعجبی ایسی نہیں کہ اس سے سرسری گزر جایا جاسکے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم نے ابوالکلام کو پہچانا اور اگر زمانہ مساعدت کرتا اور ان کے صحافتی مشاغل جاری رہتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اور کون کون سے نوادر کارنامے بروئے کار آتے اور آج کتنا بڑا ذخیرہ علم و ادب کا ہمارے سامنے موجود ہوتا۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت، قدرت کا ایک سربستہ راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آگئے اور اکثر بے نقاب نہ ہو سکے۔ ان کا ایک سبب تو زمانہ کے حالات تھے۔ جنھوں نے ان کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب ان کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام و نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور بربنائے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں بھی وہ اپنی شانِ گرانمایگی ہات سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کے دورِ صحافت کی تاریخی تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی و صحافتی زندگی کے سلسلہ میں رسالہ مخزن، اخبار وکیل اور الندوہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا لسان الصدق کے اجرا سے ہوتی ہے۔ جسے انھوں نے خود جاری کیا، خود مرتب کیا اور خود ہی بند کردیا۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں وہ کر اسے جاری کیا گیا تھا وہ مولانا کے لئے بہت تنگ تھی اور بہت سی ایسی باتیں جنھیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا۔ اتنی کم سنی کا کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر چکتے کسی عالمانہ قدم اٹھانے کا کیا ذکر ہے لیکن مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور قبل از وقت پختگی ذہن و دماغ نے ان کے مستقبل کو بھی حال میں تبدیل کر دیا تھا اور لوگ اس مستقبل کی درخشانی کو دیکھ کر حیران تھے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی کے اصرار پر الندوہ کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی، ماحول کچھ اور تھا۔ معاملہ عوام کا نہیں خواص کا تھا اور خواص بھی جماعت علماء کا، لیکن مولانا نے اپنی انفرادیت کا اعتراف کرائے بغیر ان کو بھی نہ چھوڑا۔

علامہ رشید رضا مدیر المنار ایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جا رہے ہیں اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی و اُردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر برمحل ترجمہ کرتا جائے مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں اس لئے وہ اس باب میں بہت متفکر تھے۔ آخر بجز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار" مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ سامنے آجاتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی و دلکشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی ذہانت و قابلیت کا پہلا عملی مظاہرہ جسے کھلے اسٹیج پر سینکڑوں شیدایانِ فضل و کمال نے دیکھا اور اسی وقت سے وہ حاسدانہ ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں جنھوں نے مولانا کو ندوہ و اہلِ ندوہ سے بے زار کر دیا۔ علاوہ اس کے وہ یوں بھی اپنی موجودہ خدمت سے خوش نہ تھے۔ کیوں کہ الندوہ ایک خاص تعلیمی ادارہ کا آرگن تھا۔ مولویوں کا پرچہ تھا۔ جن کی باہمی رنجشوں سے وہ تنگ آ چکے تھے اس لئے انھوں نے اس خدمت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ تاہم اس دورِ ناخوشگوار میں بھی انھوں نے الندوہ کو جس بلندی تک پہنچا دیا وہ الندوہ کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا کی خطیبانہ شہرت بھی ملک میں عام ہوتی جا رہی تھی اور ان کے اندر زیادہ آزادی، زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا ولولہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ چناں چہ آپ کلکتہ واپس گئے اور وہاں سے الہلال جاری کیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔

الہلال کے اجراء سے قبل مولانا کی صحافت زیادہ تر علم و ادب تک محدود تھی اور بہت گھٹی گھٹی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب وہ صحیح طور پر میدانِ صحافت میں آئے تو اس شان سے کہ افقِ صحافت پر ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور اک نئی گرمی ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب مصر کے جامعۂ ازہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلۂ جوالہ بن کر الہلال کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

جس وقت الہلال جاری ہوا ہے اس وقت ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا اور روئے زمین کی دوسری قوموں میں بھی سخت انتشار پیدا تھا۔ ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی۔ استقراطیت و استعماریت اپنے بقا و تحفظ کے لئے تن و جنگاں کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ ڈماکریسی کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے اور قومی آزادی و خود داری کا احساس بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی مستعمرات کا طلسم ختم تو نہ ہوا تھا۔ لیکن اس سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہر انسانیت شکن اقدام پر آمادہ تھا۔ ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بو چکی تھی۔ اس کے کلّے پھوٹ چکے تھے۔ لیکن انگریز یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس پودے کو کبھی بار آور نہ ہونے دے گا اور جماعتی تفریق پیدا کر کے ملک کی ذہنیت کو دو متضاد حصّوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی لیکن مسلمانوں کی ذہنی رفتار ہندوؤں سے مختلف تھی ان کے سامنے ملکی مسائل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں، ترکی، بلقان و طرابلس پر لگی ہوئی تھیں اور سرسیّد کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمان کے دل میں پیدا کر دیا تھا وہ بڑی حد تک اپنی جگہ قائم تھا۔ ہرچند مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے منحرف ہو چلی تھی لیکن یہ انحراف و اختلاف داخلی نہ تھا، خارجی تھا، فاعلی نہ تھا۔ انفعالی تھا۔ وطن سے اس کا تعلق نہ تھا بلکہ مذہب و مذہبیت سے تھا۔ ملکی سیاست سے نہیں بلکہ ترکی کے انقلاب، بلقان و طرابلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی وقت جب کہ کانگریس اجتماعی تحریکِ آزادی کی بنیادیں استوار کر رہی تھی۔ مسلمان پین اسلامزم کو چھوڑ کر سب سے بیرونِ ہند کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ جن کا تعلق زیادہ پان اسلامزم کی تحریک سے تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے دو قابلِ ذکر اخبار جاری تھے۔ ایک زمیندار، دوسرا مسلم گزٹ۔ زمیندار کی توجہ تمام تر ترکی پر مرکوز تھی اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ اندرونِ ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اسے بہت کم دلچسپی تھی۔

مسلم گزٹ کے اڈیٹر مولانا وحید الدین سلیم، مولانا حالی کے عزیزوں میں تھے اور قدرتاً انھیں سرسیّد تحریک سے دلچسپی ہونا چاہیئے تھی لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن تھا تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ مسلمانوں کا جماعتی اخبار تھا اور سیاست میں اس کا نقطۂ نظر ملّت پرستی ہو تو ہو لیکن خالص وطن پرستی یقیناً نہ تھا۔ وہ آزادی کا محرک، معاون ضرور

لیکن انھیں خطوط پر جو مسلم لیگ کے پیش نظر تھے وہ انگریزوں سے خوش نہیں تھا۔ لیکن اس کی بڑہمی نہ جارحانہ تھی نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا سا تھا جو روٹھتا ہے مگر منائے جانے کی توقع پر۔

یہ تھا وہ ماحول۔ یہ تھے وہ حالات، یہ تھی مسلمانوں کی عام ذہنیت جب مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصوّر ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کیا یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" میں صدرِ اسلام کی حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ملوکیت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ شخصی استبداد کا اس میں مطلقاً گزر نہ تھا۔ ہم اسے ارستقراطیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ارستقراطیت یا جماعت اشراف کی کوئی حکومت دنیا میں ایسی نظر نہیں آتی جس نے سماجی مساوات اور عدل و انصاف کی اتنی سخت پابندی کی ہو جتنی اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں کی گئی۔ ہم اسے ڈیماکریسی یا جمہوریت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خلفاء اسلام کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہ ہوتا تھا۔ ہم اسے اشتراکیت یا اشتمالیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس نے شخصی و انفرادی رائے کی آزادی کو نہیں چھینا۔ اس لئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ابتداءِ عہدِ اسلام کی حکومت خالص عربی اسلامی حکومت تھی جو خود مسلمانوں ہی نے وضع کی اور جس کی نوعیت حکومت کی تمام دوسری حکومتوں سے بالکل علیحدہ تھی۔

میں جس وقت مولانا ابوالکلام کی صحافت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی صحافت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس میں شانِ خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا لب و لہجہ خطیبانہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک بلند بانگ اخبار تھا لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی، سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب و لہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا عوام ہی کی زبان میں، اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لئے مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا اور جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مولانا نے الہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے نہایت غائر مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ تو الہلال کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیئے۔ اور فرنگی تسلّط کو ختم، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راہ ہے جس میں "شرطِ اوّل قدم آن است کہ مجنوں باشی"۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام و مشترک جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و ملّت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصولِ مقصود ممکن نہیں۔ ملک کی آیندہ سیاست کا جو نقشہ ان کے سامنے تھا اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے عملِ تخریب سے کام لیا جائے۔

کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچہ اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح و مرمت ممکن نہ ہو تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچے کو توڑا جائے اور پھر از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کج خطوط پر تعمیر کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پر عمارت قائم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہنِ انسانی رسوم و روایات سے اس حد تک داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو صفحۂ سادہ بنا کر اس پر دوسرے نقوش قائم کئے جائیں۔

یہی وہ اصولِ کار تھا جس کے پیشِ نظر انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن سے سید احمد خانی نقوش مٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کی تمام آبادی بلا امتیازِ ملّت و مذہب، بلا امتیازِ نسل و رنگ کسی ایک غرضِ مشترک پر متحد و متفق نہ ہو جائے اور یہ اشتراکِ ذہن و عمل ممکن نہ تھا جب تک مسلمان ہندوؤں سے کٹ کر اپنے جداگانہ مستقبل کی تعمیر کا خیال ترک نہ کریں اور اس راہ میں سب سے زیادہ تنفر وہی ذہنیت تھی جس نے مسلمانوں کو انگریز کے رحم و کرم پر جینا سکھایا اور جو باوجود تلخ تجربات کے اب تک اپنے جذباتِ نیازمندی ہی کو حصولِ مقصود کا صحیح ذریعہ سمجھتے تھے۔

پھر آپ الہلال کے دورِ اوّل کے پرچے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم

ہوگا کہ مولانا نے کن کن پہلوؤں اور کن کن زاویوں سے اس ذہنیت کو توڑنا چاہا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں زمانہ بڑی آپا دھاپی کا زمانہ تھا۔ سخت ذہنی غلیان کا دور تھا اور مولانا کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ان غیر ملکی مسائل کو نظر انداز کر دیتے جن سے براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کے اذہان متاثر ہو رہے تھے۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ اصل مقصد کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرابلس و بلقان کے مسائل پر بھی بالاستیعاب گفتگو کی، ترکی کی اندرونی کشاکش، اور اس کے خونچکاں انقلابات پر بھی واضح روشنی ڈالی اور جب مسجد کانپور کا حادثہ پیش آیا تو اس پر بھی پورے قلم کی پوری قوت صرف کر دی۔ پھر یہ سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے، اور ان مسائل کا تعلق اسلام و اسلامیات سے تھا بلکہ اس سے مقصود صرف ظاہر کرنا تھا کہ جب کسی قوم پر بیرونی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں تو اس قوم کا کیا حشر ہوتا ہے اور اسے کتنے ذہنی و جسمانی دکھ جھیلنا پڑتے ہیں۔

مولانا کے سامنے ہی کانگریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس کے عزائم و اقدامات سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح وہ مسلم لیگ اور اس کے نصب العین سے بھی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے کسی طرح ایک ادارہ میں تبدیل ہو جائیں اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے اصول پر اپنا لائحہ عمل مرتب کرے۔ چناں چہ الہلال کا اوّلین مقصد اسی سعی و کوشش کا دور تھا کیونکہ ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس میں تنہا شریک نہ ہوں۔ بلکہ اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر شریک ہوں۔ لیکن وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً انھیں تنہا کانگریس میں شامل ہونا پڑا۔

مولانا ابنائے ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہن تک جن جن راہوں سے پہنچنا چاہتے تھے ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشن راہ مذہب کی تھی۔ چناں چہ آپ الہلال کا فائل اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دنیاوی سیاست تعلیم کے سلسلہ میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی تائید میں انھوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کئے ہوں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لئے احکام الٰہی کی حجت سے کام نہ لیا ہو۔

دوسری راہ جو مسلمانوں کے کلچر اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لئے زیادہ قابل قبول ہو سکتی تھی ادب و انشا کی راہ تھی۔ سو اس باب میں بھی الہلال کی یہ خصوصیت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے اتنا بڑا ذخیرہ شعر و ادب کا فراہم کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعرائے فارسی کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اس کا ایک بڑا مستقر انتخاب آپ الہلال کی مدد سے پیش کر سکتے ہیں۔

مولانا کی صحافتی عظمت کا تعلق کسی ایک چیز سے نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جن میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی غیر معمولی قوت حافظہ تھی

غالباً ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے تار دیا کہ میں ان سے دہلی میں ملوں۔ وہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے برادرزادہ جمیل میاں کی تقریب شادی میں شرکت کی غرض سے دہلی آ رہے تھے۔ یوں تو باہمی مراسلت اور میری نظموں کے ذریعہ سے جو الہلال میں شائع ہوتی رہتی تھیں میں مولانا سے غیر متعارف نہ تھا لیکن ذاتی ملاقات کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ میں اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر فتح پور سے دہلی پہنچا اور کامل ایک ہفتہ تک ان کی معیت کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ اس دوران میں ادب مذہب و سیاست سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مولانا سے تبادلۂ خیال کا موقع مجھے نہ ملا ہو اور میں ان کی قوتِ حافظہ و استدلال کو دیکھ کر دنگ نہ رہ گیا ہوں۔

ایک بار حکمائے اسلام کے سلسلہ میں ابن طفیل کا ذکر آ گیا تو مولانا نے اس کی مشہور کتاب "حی بن یقظان" کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح سنا دی گویا وہ اس کے حافظ تھے۔ ایک دوسری صحبت میں جو سیاست سے شروع ہوئی اور ادب پر ختم ہوئی اس سے زیادہ دلچسپ تھی۔ انسان کے فطری احساس آزادی اور ضمیر انسانی کی بے اختیار پکار کے سلسلے میں، میں نے کہا کہ اس کے مظاہر انتہائی متضاد ماحول میں کبھی کبھی سامنے آ جاتے ہیں۔ عُرفی مدحیہ قصیدہ لکھتا ہے اور جب وہ ذہن انسانی کا تجزیہ قسمیہ اشعار کے ذریعہ سے کرتا ہے تو ایک شعر بے اختیار اس کے قلم سے ایسا بھی نکل جاتا ہے جسے عہدِ حاضر کی اشتراکیت پسندی اور سرمایہ و عمل کے تصادم کی بنیاد کہنا چاہیئے۔ کہتا ہے ؎

بزورِ بازوے چرخ نفعِ کاسبانِ ضعیف
بہ چینِ ابروے بے وجہِ خواجگانِ کبار

حیرت ہے کہ مغلیہ دورِ ملوکیت و استبداد میں یہ خیال عرفی کے ذہن میں آئے یہ سنکر مولانا کے چہرہ پر ایک رنگ آ گیا اور وہ اس موضوع پر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ناگہاں ایک صاحب اور آ گئے اور مولانا نے گفتگو کا سیاسی

پیوند عمل کر اسے ادبی رنگ میں تبدیل کر دیا اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں عرفی کا یہ قصیدہ اس کا شاہکار ہے اور اس کے تمام قصیدہ اشعار اس طرح سنانا شروع کئے گویا کتاب ان کے سامنے کھلی رکھی تھی۔

مولانا کا حافظہ اس میں شک نہیں عجیب و غریب خداداد ودیعت تھی اور مولانا کی صحافتی و علمی زندگی کی کامیابی بہت کچھ اسی انعام خداوندی کی ممنون تھی۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت جس نے الہلال کو معراج کمال تک پہنچایا وہ مولانا کا مخصوص اسلوب تحریر تھا۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس باب میں "ذوالریاستین" ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کے اسلوب تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں ایسی تھیں جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلند ادبیت، دوسری اس کی شانِ خطابت کہ جب ہم الہلال کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پر کھڑا ہوا پُرجوش خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا ایک ایسی عجیب و غریب طرزِ تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرأت کر سکا۔

الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا لیکن طریق ابلاغ کچھ مختلف تھا تیور وہی تھے لیکن رُخ دوسرا تھا، انداز فکر وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال نفسیات عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیات ذہنی کا۔ الہلال حرکت و عمل، جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔ الہلال کا پیام تھا۔

"شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے زن"

اور البلاغ کا: "جلوہ بر خود کن و خود را بہ نگاہے دریاب"

الہلال۔ خونِ منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوتِ دار و رسن، البلاغ بشارتِ روحانی تھی اور پیامِ طاغوتیت شکن۔

الہلال۔ عرفی کی زبان میں نوید سرفروشی تھا کہ

بہ عہد پیالۂ خونیں بخور ز قصاباں
مشو گدائے شباناں کہ شیر می دوشند

اور البلاغ۔ بیدل کی زبان میں پیام تھا۔ "خونے بہ جگر جمع کن و بروں آ سگا"

الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔ ایک بیباکانہ اعلان کہ

ناوک دلانِ باغِ تو چوں شبنمِ سحر
بر روئے برگ گل شکنند آبگینہ ہا

اور البلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا کہ

دلِ گم گشتہ مرا سخت زکیفیتِ شوق
نشۂ بادہ گر از دست رود شیشۂ ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ الہلال نے دامنِ کتاں چاک کیا اور البلاغ نے اس چاک سے نظارۂ پرتوِ ماہ کی دعوت دی۔

الہلال مولانا کی تمام خصوصیات ذہنی کا ایک ایسا رنگین دستہ گل تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قدرِ اوّل کا میگزین بھی جس میں سیاسی مقالات، علمی و تاریخی مضامین، مذہبی و ادبی مباحث، مطائبات، منظومات، غرض وہ سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوقِ انسانی آسودہ ہو سکتا ہے اور جو اپنے بعد ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پُر ہونا ممکن نہیں اور البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے تھا تاکہ ان کے ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش محو کر کے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصود انسانیت پرستی سوا کچھ نہیں اور جو ماورائے پردہ حرم "ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد" کا مبلغ ہے۔

اس طرح ہم مولانا کے زمانِ صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ جو مخزن، اخبار وکیل اور لسان الصدق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دور الہلال کا اور تیسرا البلاغ کا۔ دورِ اوّل خالص علمی تھا۔ دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور ان تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی انفرادیت و "انانیت" کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انانیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ ان تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیت ایقان پائی جاتی تھی وہ صرف لفظ "انانیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ جس میں منطقی چوں و چرا اور استدلالی "ایں و آں" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و قائدانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی، سرعسکرانہ رجز خوانی، مردِ مجاہد کا سا اذعان و ایقان، کا ہنوں کا سا وزن و وقار، جس نے ہم کو نیا ولولۂ حیات، نیا جوشِ زندگی بخشا، اب کہاں؟

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

جمیل مظہری

ماتمِ آزاد

آہ اے آزاد، اے بھارت کے لعلِ شب چراغ　　آہ اے آزاد اے قومی سیاست کے دماغ
لہلہایا تیرے خونِ دل سے آزادی کا باغ　　تجھ کو تربت میں مبارک آج لمحاتِ فراغ

کارواں جائے کدھر اب رہبری کے واسطے
ذہن بھٹکے پھر رہے ہیں روشنی کے واسطے

ہند کی تاریخ کا تو مستقل اک باب تھا　　کچھ دنوں تک سب جسے دیکھا کئے وہ خواب تھا
سینۂ ہندوستاں کا شعلۂ شاداب تھا　　زینتِ کرسی و زیبِ منبر و محراب تھا

کیوں نہ تجھ کو اک چمن، اک بزمِ رندانہ کہیں
اک ادارہ اک دبستاں اک کتب خانہ کہیں

تیرا ہر نقشِ ادب اک نقشِ پائے اعتبار　　سرمۂ چشمِ بصیرت تیری خاطر کا غبار
تیرا آہنگِ خطابت جوشِ قلزم در کنار　　کچھ سمندر کا جلال اور کچھ پہاڑوں کا وقار

نبضِ ملت میں دھمک تیرے لبِ گفتار سے
دھڑکنیں دل کی معین وقت کی رفتار سے

فلسفے کی روح گھل کر جانِ میخانہ بنی　　شوخیٔ تحریر سے تاریخ افسانہ بنی
خامشی محفل میں کیف و کم کا پیمانہ بنی　　سینۂ چاک گیسوئے الہام کا شانہ بنی

ایک بے تابی حرم سے تا بہ بتخانہ ہے آج
سوزِ دل تیرا متاعِ شمع و پروانہ ہے آج

مرحبا اے ساقیٔ کیف و نشاطِ حریت　　ذہنِ مستقبل ہیں تجھ سے انبساطِ حریت
مرحبا اے مجلس آرائے بساطِ حریت　　کس قدر باریک و نازک تھی صراطِ حریت

پائے ہمت کو ترے دی اک خلش ہر خار نے
چن لئے کانٹے بیاباں سے تری رفتار نے

آستانوں سے اٹھائی تو نے تہذیبِ سجود سربلندوں کو سکھائی تو نے تعظیمِ حدود
کیوں مؤرخ پہ نہ گم ہوں تیری آیاتِ شہود تو نے خود مقصد پہ قرباں کر دیا حبِّ نمود

روشنی کیونکر پہنچتی امرکہ میں روس میں
شمع تو جلتی رہی تا زندگی فانوس میں

وقت کو تو نے دیا اک شوخ آہنگِ خرام جوش کو سنجیدگی، جذبات کو اک انتظام
ہند کو روحِ عمل، اردو کو اک زورِ کلام راکھ کو چنگاریاں، شعلے کو اک رقصِ دوام

سوز کو اک نغمگی دی ساز کو نغمہ دیا
اب بھی کیا تاریخ پوچھے گی کہ تو نے کیا دیا

ہوگا جب تیرا کمالِ باغیانہ بے نقاب کھیت سے تاروں کے جب اُگنے لگیں گے آفتاب
تب وفا اس دل کے زخموں کا لگائے گی حساب جس کے خونِ نو کا ہر قطرہ تھا تخمِ انقلاب

جس کے چھینٹوں سے ہری کشتِ چمن ہے آج بھی
جس کی سُرخی غازۂ روئے وطن ہے آج بھی

ناخدا کو بھی سُلا سکتے ہیں جھونکے خواب کے جاگی طوفانوں کی قسمت دن پھرے گرداب کے
دھمکیاں ساحل کو دیں اب حوصلے سیلاب کے اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر احباب کے

تیرگی سی ہے دماغوں میں مناظر کی طرح
صبح کا چہرہ بھی اترا ہے جواہر کی طرح

پھر بھی تیری روح زندہ ہے کہ زندہ ہے وفا سن رہے ہیں موت کا ہم فاتحانہ قہقہا
کیوں نہ اس بے رحم کا ہم بھی اڑائیں مضحکا نعرۂ "آزاد زندہ باد" سے گونجے فضا

ہے طبیعت پر جو مایوسی کا زنگ اڑنے لگے
سن کے نعرے موت کے چہرے کا رنگ اڑنے لگے

اے جلوسِ آخری تیرا نگاہوں کا سلام گرم اشکوں کا سلام اور سرد آہوں کا سلام
رہبروں کا، رہروؤں کا، شاہراہوں کا سلام عالموں کا، شاعروں کا، کج کلاہوں کا سلام

آج وہ دن ہے کہ بھارت کا علَم سجدے میں ہے
مظہری سجدے میں ہے اس کا قلم سجدے میں ہے



حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

(عطیہ محمد اجمل خاں صاحب)

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو

در سینه‌های مردم عارف مزار ماست (رومی)

Seek not on earth for our dust after we die,
In the hearts of men of love our sepulchre lies.

Indo-Iran

'الہلال' کے پہلے صفحے کا عکس



الہلال

ایک ہفتہ وار مصور رسالہ

AL-HILAL

فہرس

تصاویر



مولانا آزاد بہ حیثیت ایڈیٹر 'الہلال' و 'البلاغ'



مولانا آزاد ۱۹۱۲ء میں

محمد اجمل خاں

مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور اُن کے جواب

اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کمیٹی کے ساتھ گرفتار کر کے راتوں رات ہندوستان میں کسی جگہ بھیج دیا گیا۔ عام افواہ یہ تھی کہ ہندوستان سے باہر کہیں بھیجے گئے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ احمد نگر کا قلعہ ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" والا رزولیوشن پاس کر دیا تھا۔ کانگرس سے یہ امید نہ رہی تھی کہ وہ برٹش جنگ کو بلا شرط اپنی جنگ سمجھے۔

میں اور بھابھی (یعنی مسز ارونا آصف علی) بھی کسی نہ کسی طرح اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مولانا نہایت خندہ پیشانی سے اپنے ورکنگ کمیٹی کے ساتھیوں کا استقبال کر رہے تھے، اس لئے کہ وہ بحیثیت صدر کانگرس کے سب سے پہلے گرفتار کئے گئے تھے اور چونکہ بھولا بھائی ڈیسائی ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے چکے تھے اس لئے وہ گھر ہی پر رہ گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہاں کہیں چائے بھی ملے گی۔ میں نے ہر طرف تلاش کیا، کسی کا پتہ نہ چلا۔ ریفریشمنٹ روم بند تھا۔ اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور اس نے فہرست نکالی جس میں میرا نام نہ تھا۔ ہمیں گاڑی میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ ارونا جی بھی باہر ہی رہیں۔ کہا گیا کہ ریل میں چائے کا انتظام ہے۔ جب سب آ گئے تو دوبارہ حاضری لی گئی اور ریل خدا جانے کہاں چل دی۔

گوالیہ ٹینک پر والنٹیروں اور والنٹیرنیوں کی پریڈ تھی۔ وہاں مولانا آزاد یا پنڈت جی جھنڈا لہرانے اور آزادی کا زندہ دوش سنانے والے تھے۔ ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر رضا کاروں کو نہ تھی۔ وہ سب منتظر تھے۔ ہم (ارونا جی اور میں) وہاں پہنچے۔ ارونا جی نے جھنڈا لہرایا۔ پولیس نے جس میں گورے سپاہی زیادہ تھے مداخلت کی۔ میدان کو چاروں طرف سے دخانی توپوں سے گھیر لیا گیا تھا۔ ننھے ننھے رضا کار بچوں، لڑکیوں اور لڑکوں پر یکایک گولہ باری ہونے لگی۔ ہم نے اس تہلکہ کو دیکھ کر جلدی جلدی "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" ختم کیا۔ اور معصوموں کو دھوئیں کی دم گھٹا دینے والی اور زہریلی تیزی سے بچانے کی کوشش کی۔ انگریز سپاہیوں نے نہتے راہ گیروں کو پستول کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ دھیرو بھائی ڈیسائی اور ان کی دھرم پتنی مع کچھ اور لوگوں کے پہنچ گئیں۔ بیہوش لڑکیوں کو اسپتال بھیجنے کا انتظام ہونے لگا اور لاشوں کے لئے

. . . . .

احمد نگر فورٹ جیل میں اخبار بھی بند تھے۔ آخر وہ قیدی کیوں اپنی بے بسی کے عالم میں ہندوستانیوں کے قتل و خون کے قصے پڑھیں؟

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اس پس منظر کے بعد مولانا نے اپنا غم غلط کرنے یا یوں سمجھئے کہ اپنے دل بوجھ کو ہلکا کرنے کیلئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ لکھنے لگے۔ مخاطب نواب صدر یار جنگ مرحوم تھے۔ خطوط سیاسی نہ تھے۔ یعنی نہ اُن میں منطقی خشکی کے ساتھ تاریخی حقائق سے نتیجے نکالے گئے تھے، نہ قربانی کے فلسفے پر لکچر تھے۔ اور اگر یہ ہوتے بھی تو کس کے لئے ہوتے۔ قلعہ سے ایک پرچہ بھی باہر نہ جا

سکتا تھا۔ نیز یہ لوگ اس طرح کے تھے کہ خفیہ سوسائٹی کے اصولوں کو مانتے۔ وہ مہاتما جی کے بتلائے ہوئے اصول کے پابند تھے یعنی "مقصد کے ساتھ ساتھ ذرائع مقصد بھی پاکیزہ و مناسب یا جائز ہوں۔ نوجوان طبقہ اس اصول کو مانتا تھا اور کہتا تھا کہ جن اصولوں کو ہمارے بڑے بڑے (یعنی ورکنگ کمیٹی کے ممبر) ناجائز سمجھتے ہیں، وہ اگرچہ عام حالات میں ناجائز سمجھے جائیں مگر مقصد کی پاکیزگی انھیں بھی پاکیزہ بنا دیتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کا ہاتھ کاٹنا برا سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر اس ہاتھ کی بدولت سوسائٹی کا مسلسل نقصان ہوتا ہو تو کیا اس ہاتھ کو کاٹنا نامناسب سمجھا جائے گا یا اگر خود اس شخص کا ہاتھ سڑ رہا ہو تو کیا ڈاکٹر کی رائے نہ مانی جائے گی۔ بہرحال یہ لوگ خفیہ کارگزاری کے خلاف تھے۔ اور کوئی خط اس طرح باہر نہ بھیج سکتے تھے۔

مجبوراً مولانا نے خطوط لکھنے شروع کئے۔ جواہر لال جی نے "ہندوستان کی تلاش" شروع کر دی۔ اور جب میں نے مولانا کے ان خطوط کو شائع کیا تو بہت سے ادب نوازوں نے تو یہاں تک مجھے لکھنا شروع کیا کہ کاش یہ لوگ سیاست میں نہ پڑتے اور عمر بھر قید و بند میں رہتے تاکہ ایسے ایسے تاریخی و ادبی شاہکار تیار ہوتے رہتے۔ دیکھا آپ نے ان خود غرضوں کو! یہ لوگ تو جیل سے باہر رہ کر دنیا کی عیش کرتے اور لیڈر بیچارے دیوار زنداں سے سر پھوڑا کرتے۔

خود ان کی قید ایک پیغام تھی، جس نے پورے ملک کو یہ دعوت دی تھی کہ

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت، بہ منبر نتواں گفت

"الہلال" و "البلاغ" نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی۔ "ہریجن" کا بھی پیغام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان لوگوں کی گرفتاری کی صبح کو جو ہفتہ وار "ہریجن" نکلا تھا وہ پانچ پانچ روپے میں بکا۔ گیا اور پھر دس دس روپے میں۔ اس میں پیغام تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہزاروں نوجوانوں نے سینے پر گولیاں کھائیں۔ اور آخرکار حکومت برطانیہ مجبور ہوئی کہ اپنا بستر سنبھالے۔ Quit India زندہ باد!

مولانا نے اپنی زندگی میں مختلف حیثیتوں سے ہزاروں خط لکھے اور بھیجے ہوں گے۔ ان خطوں کی الگ الگ قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ سب کا شمار نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن آپ کے ادبی خطوط کی نثر میں جو شعریت پائی جاتی ہے وہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے۔ ہاں انھوں نے جو خط سیاسی لکھے ہیں ان میں ہر صنف کا خط ظاہر کرتا ہے کہ کاتب مدبر ہے، مبلغ ہے، فقیہ ہے۔

دوست ہے، بزرگ ہے، یا کیا ہے!

حسرت موہانی نے اشعار کی کئی قسمیں کی ہیں جس کلام میں آمد ہی آمد ہو وہ عاشقانہ، عارفانہ یا فاسقانہ ہوگا۔ جس میں آورد ہی آورد ہو وہ ماہرانہ، ناقدانہ یا ضاحکانہ ہوگا۔ جس میں آمد و آورد مخلوط ہو وہ شاعرانہ، واعظانہ یا باطنیانہ ہو سکتا ہے۔ ضاحکانہ کلام میں اگر ابتذال ہو تو وہ سوقیانہ ہو جائے۔ اور فاسقانہ کلام میں جذبات ہوس کی جگہ مذہب یا حکومت پر حملہ ہو اور سوسائٹی کو انقلاب کی دعوت دی جائے تو وہ باغیانہ ہے۔

اگر ہم نثر مسجع و عاری وغیرہ کی صوری صنعت گری سے قطع نظر کر لیں تو معنوی حیثیت سے حسرت کی تبویب نثر پر بھی عائد ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً حاکمانہ (جابرانہ، ظالمانہ یا عادلانہ)، عالمانہ (مورخانہ، ناقدانہ، فلسفیانہ)، احمقانہ یا مجنونانہ (مثلاً بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی)۔ غاویانہ (مجرمانہ لاابالیانہ، والشعراء یتبعہم الغاوون)۔ ناصحانہ (مشفقانہ، دوستانہ) بے بسانہ (فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے)۔ اسی کی ایک قسم بولنا بھی ہو سکتی ہے۔ خاموشانہ (یعنی وہ کلام جس کا جواب خاموشی ہو)۔ خاموشی کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ سوال ہی لغو نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جواب کے لئے سائل کی بصیرت و علم اونچے درجے کی نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ جواب نہ دینے میں کوئی مصلحت ہو۔ چوتھے یہ کہ جواب دینے سے فتنہ بڑھنے کا اندیشہ ہو اسی لئے ایک محاورہ بن گیا ہے کہ گفتار کی کمائی ہنس کے ٹالی۔ بہرحال

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید

ذیل میں ہم چند خطوط کے اقتباسات دیتے ہیں، جو دوسروں نے مولانا کو لکھے تھے۔ بعض کے جواب مفصل دئے گئے ہیں۔ بعض کے دو حرفی ہیں۔ اور بعض کے متعلق خموشی ہی جواب ہے۔ ان خطوط میں آپ کو "غبار خاطر" کے خطوں کا لطف تو شاید نہ آئے، اس لئے کہ وہ ایک خاص صنف کے خط ہیں اور یہ زیادہ "غبار خاطر" کو ادبیت کے غم میں غرق کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن علاوہ سیاست کے دوسرے میدان بھی ہیں جن میں مولانا کے فیصلے نہ صرف ناطق ہیں بلکہ محترم ہیں۔ یہ خط انھیں پیش کئے گئے اور وہ پیش کرتے ہیں ان کے جواب برجستہ اور بے تکان دئے گئے۔ جواب دینے میں زیادہ ... کا قائل نہیں

ہوا۔ ان میں سیاسی خطوط نہیں ہیں اور محض نمونۃً الحروف دارے ہیں جنھیں موقع ملنے پر شائع کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط تبرکاً یہاں درج کردیتا ہوں۔ یہ خط مولانا محمد میاں فاروقی (حال ام۔ پی) کو لکھا گیا تھا۔ مولانا احمد نگر جیل سے بانکوڑا بھیج دئے گئے تھے اور ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا کر دئے گئے تھے۔

دام لواس

بانکوڑا

۱۵۔ جون ۱۹۴۵ء

صدیق العزیز   جیسا کہ کل شام آپ کو ریڈیو سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ آج صبح مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں آج رات کی ٹرین سے کلکتہ جا رہا ہوں۔ میں نے اس وقت ایک تار ایکسپریس آپ کے نام اس مضمون کا بھیجا ہے کہ اجمل خاں صاحب بلا تاخیر کلکتہ آجائیں۔ امید ہے کہ وہ تار ملتے ہی روانہ ہوگئے ہونگے۔

کھڑک پور میں آپ کو دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی تھی۔ اس محبت و اخلاص کے لئے شکرگزار ہوں۔ افسوس ہے کہ بہ اطمینان گفتگو کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لئے چند منٹوں سے زیادہ ملاقات کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہونگے۔   والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

یہ دو خط جناب اقبال شیدائی صاحب کے ہیں۔ یہ بہت پرانے ہندوستانی نیشنلسٹ ہیں اور آج کل اپنے سوانح حیات لکھ رہے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۵ء میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم (۱۸۷۲ - ۱۹۴۱) کابل میں تھے اور وہاں انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھر جب وہاں دو انقلابیوں یعنی مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ نے ہندوستانی عارضی حکومت قائم کی تو اس کے وزیر داخلہ تھے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی مرحوم پرائم منسٹر تھے (جنھوں نے ۱۹۲۷ء میں کیلیفورنیہ میں وفات پائی)۔ مولوی محمد بشیر صاحب امیر مجاہدین سرحد وزیر جنگ تھے۔ ڈاکٹر رحمت علی (جو آج کل لاہور یونیورسٹی میں فرنچ پڑھاتے ہیں) وزیر رسل و رسائل تھے۔ مسٹر پلّے وزیر خارجہ تھے (جو برلن میں نازیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے) اور راجہ مہندر پرتاپ (جو آج کل رکن پارلیمان ہند ہیں) حکومت کابل آزادانہ اور انقلابیان ہند کے صدر تھے۔ اقبال شیدائی صاحب بھی وزارت جنگ و رسل و رسائل کے نائب وزیر تھے۔ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کابل بھیجا تھا۔ اب وہ پاکستانی ہیں اور اتحاد اسلامی کے خواہش مند ہیں۔

یہاں علم تنجیم یا جوتش کا خیال آگیا۔ میرے سامنے متعدد "اقبال" اپنی اپنی شان میں نظر آنے لگے۔ مثلاً اقبال محمد خاں سہیل (مرحوم) شاعر ادیب، ڈاکٹر اقبال شاعر۔ ڈاکٹر اقبال (پروفیسر لاہور)۔ پروفیسر اقبال علی شاہ (میرٹھی مصنف) اقبال شیدائی صاحب انقلابی۔ سر اقبال (جج ہائی کورٹ) اقبال سنگھ (کرکٹ)۔۔۔۔

بسم اللہ تعالیٰ

۱۲ جون [illegible]

سیدی و مولائی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

یہ غالباً تیسرا مکتوب ہے جو خدمت عالی میں ارسال کر رہا ہوں۔ اس مکتوب کے ساتھ چند صفحات ایک خاص واقعہ کے متعلق جو اب تاریخی واقعہ ہوچکا ہے ارسال خدمت ہیں۔ دو ایک عربی اخبارات کے کٹنگ بھی بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے باعث دلچسپی ہوں۔ ایک اور صحیفہ بھی ہے جو مولوی فضل الٰہی صاحب مرحوم و مغفور نے ہٹلر مرحوم اور سینیر موسولینی مرحوم کو لکھا تھا۔ اور جس کی کاپی مولوی صاحب مرحوم نے مجھے دی تھی۔ کسی دوسرے وقت میں ارسال کر دوں گا۔ یہ سب چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، اور بہت ممکن ہے، ہندوستانی تاریخ نویس اس سے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔

سفر کے جواب کا ایک مدت سے منتظر ہوں۔ تاخیر غالباً گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے ہوگی۔ جواب آنے پر یہاں سے سفر کی تاریخ مقرر کروں گا۔

والسلام

حضور کا خادم

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

قاہرہ ۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء

حضرۃ مولانا صاحب قبلہ ۔ سلام مسنون ۔ مکرمی محمد اجمل خاں صاحب نے میرے خط سے مکتوب کا جواب دیا ۔ کہ حضور بیرسٹر دست بدعا ہیں کہ مجھے سکون و اطمینان حاصل ہو ۔ شکریہ ۔ مسلمان ممالک میں سکون و اطمینان کسی حساس شخص کو حاصل ہونا جوئے شیر کا لانا ہے ۔ بہرحال مایوسی گناہ ہے ۔

میں ابھی یہاں کچھ روز اور قیام کروں گا ۔ ارادہ ہے کہ اس ماہ کے آخر میں چلا جاؤں ۔ وہاں پرانے دوست بھی ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر کچھ تجارتی کام کروں ۔ آخر دن کوٹ کرنا ہے ۔ فی الحال بہ نظر کوئی خاص مقصد نہیں ۔ یعنی سیاسی ۔ خدا کرے کچھ تجارتی کام چل نکلے ۔ دعا فرمایئے گا ۔

یہاں مسٹر ڈیسائی ہائی کمشنر اتفاق سے مل گئے ۔ ان کے ہاتھ ایک مکتوب خدمت عالی میں بھیج دیا ۔ استاد مرحوم کا مرید ہوں یعنی ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

اجمل خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضور کا خادم اور دعا کا طلبگار

اقبالی

یہ دو خط ایک ایسے شورش پسند کے ہیں جس کا خصوصیات ہی حرکت و ہیجان ہے ۔ جس نے اپنے قید و بند کے زمانے میں جیلروں تک کو انقلاب پسند نہیں بلکہ انقلابی بنا دیا ۔ وہ ایک کوہ وقار ہے جو بچپن سے آج تک چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم ہے ۔ شمع حریت کے ان پروانوں کے سوز و گداز کو کوئی کیا جانے ! مولانا کے بعد

ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں !

محترم المقام ۔ سلام مسنون ۔

ادارۂ ہفت روزہ "چٹان" نے فیصلہ کیا ہے ۔ کہ ۱۹۵۷ء کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع صفات شخصیت سے متعلق ایک خاص اور ضخیم نمبر شائع کرے ۔ دعا ہے ایک اعتراف ہوگا ۔ ان علمی ۔ ادبی ۔ تفسیری ۔ دینی اور سیاسی خدمات کا جو اس بزرگ ہستی نے پچھلی نصف صدی میں سرانجام دی ہیں ۔

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم اس نمبر کو مولانا کی شان کے شایان اور ان کے مذاق کی نفاست کے مطابق شائع کریں ۔ اس ضمن میں ہم نے ان تمام اہل قلم اور اہل سیاست سے رجوع کیا ہے ۔ جو مولانا سے قریب رہے ۔ یا آپ کی عظمت کے کسی نہ کسی اعتبار سے معترف ہیں ۔

نیازکار

شورش کاشمیری

ایڈیٹر "چٹان" لاہور

بھائی اجمل

سلام مسنون ' آج ہی ایک خط ' حضرت مولانا مدظلہٗ کو بھی لکھا ہے ' کبھی تو ان کی نگہ التفات کو آمادہ کیجئے ۔ ؏

ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لئے

اس دفعہ سالنامہ کی ترتیب و تزئین کا اچھا خاصہ نقشہ جمایا ہے ' دو سو صفحے ' کئی تصویریں ۔۔۔ سہ رنگی و یک رنگی ' پریس اپنا ہے ' آپ طباعت دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے ۔۔۔ اپنے قلم کو بھی حرکت میں لایئے ۔ مولانا مدظلہٗ کی سیرت کے بعض خاص پہلوؤں پر کچھ لکھئے ۔

یہ میری دوستانہ استدعا ہی نہیں درد مندانہ خواہش بھی ہے ' ایک بات مزید پیش نظر ہے کہ پندرہ دسمبر تک مضمون مل جائیں ۔۔۔ آپ کا بھی اور مولانا کا بھی ۔۔۔ فرمایئے اُن سے کیسے التماس ہو ،

جواب کا منتظر

المخلص

شورش کاشمیری

9-11-55

جواب ۔ کبھی موقع ہو تو آپ دہلی آ کر مل لیں ۔

ایک ہندو سنیاسی کا خط

۲۴ جنوری ۱۹۵۸ء

مخدوم مکرم جناب پیر مرشد صاحب دام ظلکم

بندہ ایک عرصہ سے آرزو خاص دل میں پوشیدہ رکھتا تھا کہ جناب کی خدمت میں چند حروف ارسال کروں مگر بوجہ تو کل وغیرہ دیگر مجبوریاں تھیں۔ آج خوش قسمتی سے تحریر کرتا ہوں اُمید قوی ہے کہ جواب دے کر بندہ پر بڑی عنایت کریں گے تاہم ڈر بھی ہے کہ ایک ملک کا اتنا بڑا آدمی اک غریب فقیر کو کیوں جواب بھیجنے لگا مگر بلند خیالی و پاک دامنی کا سہرہ لوح دنیا پر ہر سو پھیلا ہوا ہے اس لئے امید ہے۔

آج میں نے ہندی کی نثر و شاعری کی ایک کتاب پر غور کیا جس میں ملک محمد جائسی کے تصانیف اشعار تھے۔ ایک ہندی شاعر نے ان کو "صوفی" لکھا جس کو میں بھی مانتا ہوں اور ہر شخص ماننے کو تیار ہے۔ مگر مذکورہ کتاب کے اندر "صوفی" الفاظ کی تشریح نے مجھے پریشان کر دیا۔ بعض اشخاص نے تو صوفی اس جماعت کا نام لکھا ہے جو سفید اون کے کپڑے پہنتے تھے۔ غرض کتنے ہی الفاظ بے تکے تھے۔ کیا میں امید کروں کہ وقت سیاست سے نکال کر مجھے دو الفاظ میں صوفی الفاظ کے مرادف الفاظ و نیز اس جماعت کی ابتدائے تواریخ پہ چند حروف عنایت فرمائیں گے۔

میں ایک ہندو فقیر (سنیاسی) ہوں اور اردو ہندی دونوں سے پریم ہے۔ امید ہے حروف غلط وغیرہ و دیگر غلطی پر غور نہ کریں گے۔ مجھے یہ شعر نا معلوم کیوں پسند ہے۔

ہزاروں بندے تو ہیں خدا کے بتوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آپ کا خیر اندیش

سوامی۔ برہم دت ہنس

جواب:۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ یونانی لفظ سوفی یونان سے نکلا ہے جس کے معنی حکمت و عقل ہیں۔ اس سے فیلا سوفی بنا ہے۔ قطعی طور پر کہنا مشکل ہے لیکن یہی خیال زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

رانی کھیت ضلع الموڑہ

۱۰/۱۳ ستمبر ۱۹۵۴ء

فضیلت مآب قبلہ مولانا صاحب مدظلہٗ

آداب۔ آپ پر بخوبی روشن ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لئے شیخ سعدی کی مشہور و مستند تصنیف گلستاں سے بہتر کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس لطیف کتاب کے ہندی ترجمہ کی ایک جلد میرے پاس موجود ہے جو غالباً ساٹھ ستر سال ہوئے دہلی میں چھپی تھی۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ محکمہ تعلیم یا کوئی اور شعبۂ تعلیم اس ترجمہ کو چھپوا کر شیخ سعدی کے پند و نصائح سے اہل ہند کو مستفیض کرے۔ قدر طلب یہ ہندی کتاب بہ سر چشم ارسال خدمت ہوگی۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ انگریزوں کے عہد میں جب آپ احمد نگر کے قلعہ میں سلطانی مہمان یا خاکم بدہن اسیر تھے تو ایک چڑیا سے جو آپ کے کمرہ میں مخل ہو کر باعثِ تکلیف ہوتی تھی آپ کو زیر ہونا پڑا کیونکہ اس کو مداخلت سے روکنے کی تمام تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں۔ مبادا موجودہ سیاسی جدوجہد میں پھر حالات مانع رونما ہو جائیں یہ تجویز پیش خدمت ہے کہ آئندہ آپ کے لبتہ وزارت میں ایک دیر کا گیند بھی اضافہ کر دیا جائے۔ جو بوقتِ ضرورت ایسے مدخلین بیجا کے تدارک و اندفاع میں تیر و تفنگ تو کیا بم اور بومرینگ (Boomrang) سے بھی زیادہ مؤثر ہوگی۔

چونکہ میں مہاجر اور مزدور ہوں اس خدمت کے اجر کا بھی مستحق ہوں اور اجر بھی تجویز کر دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ مجھے دو غزلوں کی نقلیں جن کے ایک ایک مصرع ذیل میں منقول ہیں عنایت فرمائی جائیں۔ ان کے حصول میں میں اب تک ناکام رہا۔

۱۔ بیا در کشتی چشم نشیں و سیر دریا کن

۲۔ منم آں شمع تنہائی کہ در ویرانہ می سوزد

نیز مغلیہ بادشاہوں کے مشہور عالم باغ موسومہ شالامار کے صحیح نام اور وجہ تسمیہ سے بھی مطلع فرمائیں۔ یاد پڑتا ہے کہ وقائع نعمت خاں عالی میں مذکور ہے کہ اس کا اصل نام شعلہ ماہ باغ تھا۔ براہ کرم اس کی تدقیق و

تصدیق فرمائیں۔ اخبار Blitz نے اس سے متعلق ایک غلط بیان شائع کیا ہے اس کی تصحیح اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دعاگو و محتاج دعا

نیاز مند

مری کرشن داس رس خراب آبادی

جواب :۔ پہلا مصرعہ آتشی قندھاری کا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ذکر کیا ہے اور یہ مطلع لکھا ہے۔

شالامار کے بارے میں کئی رائیں ہیں لیکن صحیح وجہ تسمیہ نہیں بیان کی جا سکتی۔ شالامار باغ دلّی میں بھی تھا اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کا وہیں سے اعلان کیا تھا۔ لیکن اب اس کا نام نشان باقی نہیں رہا۔

. . . .

مکرم و محترم چودھری غلام رسول مہر (سابق اڈیٹر انقلاب لاہور) اردو کے بہترین ادیب، فارسی کے رمز شناس، عربی اور انگریزی ادب کے قدردان کا مولانا سے بہت قدیم یارانہ ہے۔ سیاسی زلزلوں نے اس رشتہ کو جنبش نہیں دی بلکہ مزید استواری بخشی۔ لاہور میں اُن سے مولانا کی ملاقاتیں بھی مجھے یاد ہیں اور تقسیم ہند کے بعد مہر صاحب کا دلّی میں مولانا کے یہاں فروکش ہونا بھی کل کی بات ہے۔ ان کے خطوں پر جو مولانا کے جواب ہیں وہی باہمی محبت و خلوص کے لئے شاہد عدل ہیں۔

باسمہ سبحانہ

۲۲۔ مارچ ۱۹۵۸ء

برادر محترم۔ میں نے جب آپ کو لکھا تھا کہ جلد آ رہا ہوں تو اسی وقت تیاری کر لی تھی۔ لیکن دفعۃً بیمار ہو گیا اور اب تک بیماری سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ ذرا طبیعت سنبھلے تو چند روز کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ چند ضروری باتیں پیش نظر ہیں۔ پھر میں یورپ جانا چاہتا ہوں۔ اغلب ہے اس سفر میں چار پانچ مہینے لگ جائیں۔

یہاں پنجاب یونیورسٹی ایک دائرۃ المعارف مرتب کر رہی ہے۔ اس کے لئے حضرت مولانا کے متعلق ایک مقالہ میرے ذمے لگا ہے۔ وہ تمام حالات میرے پیش نظر ہیں جو مولانا نے اپنی تصانیف میں ضمناً لکھے یا دوسرے اصحاب نے مستقل کتابیں تصنیف کرتے وقت تحریر کئے۔ بعض امور کے متعلق تعین کے ساتھ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیا آپ ازراہِ عنایت میرا عریضہ مولانا کو سُنا کر جوابات لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟ یہ مقالہ چونکہ دائرۃ المعارف میں چھپے گا۔ اس لئے تمام معلومات زیادہ سے زیادہ واضح اور مستند ہونی چاہئیں۔ مثلاً

۱۔ مولانا کا سالِ ولادت ۱۳۰۵ھ ہے۔ لیکن مہینے، تاریخ اور دن کے متعلق کہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۲۔ "لسان الصدق" کا پہلا پرچہ ۲۰۔ نومبر ۱۹۰۳ء کو نکلا تھا۔ یہ پرچہ اور متفرق پرچے میرے پاس ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کب تک جاری رہا؟

۳۔ "الندوہ" کی ایڈیٹری کا زمانہ ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک کا معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس تعلق کی قطعی تاریخیں معلوم ہو سکتی ہیں؟

۴۔ مولانا "وکیل" میں کب سے کب تک رہے؟

۵۔ مولانا کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ عراق کا سفر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ کیا اس کی صحیح تاریخ اور مدت کا علم ہو سکتا ہے؟ مولانا کے بھائی کا انتقال کس مقام پر ہوا تھا؟

۶۔ مختلف لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا بسلسلۂ تعلیم مصر بھی گئے تھے۔ یہ سفر کس زمانے میں ہوا تھا؟

۷۔ مولانا کے والد ماجد ۱۸۹۵ء میں حجاز گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔

۸۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہے، اس لئے کہ بمبئی، بنگال، برما وغیرہ میں ان کے بے شمار مرید تھے۔ مستقل اقامت کی نیت سے ۱۸۹۸ء میں آئے۔ کیا یہ درست ہے؟

۹۔ مولانا کے والدین کی تاریخ ہائے وفات؛ میں نے ۱۹۲۶ء میں ان کی قبروں کی زیارت کی تھی اور تاریخیں لکھ لی تھیں، لیکن اب وہ تحریر کہیں کاغذوں میں گم ہو گئی ہے اور نہیں ملتی

۱۰۔ رانچی میں مدتِ قیام کو "نظربندی" سے تعبیر کرنا درست ہوگا یا "اسیری" سے۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اس مدت کو "اسیری" میں محسوب کیا ہے۔

میں نے بڑی ہمت کر کے یہ سطریں لکھی ہیں لطفاً یہ بھی لکھئے کہ مولانا کی صحت اب کیسی ہے۔ مجھے ہر حال میں جلد آنا ہے۔ صرف اس انتظار میں ہوں کہ ذرا طبیعت

سنبھل جائے تاکہ سفر کے قابل ہو جاؤں۔

امید ہے آپ بخیر ہوں۔ سید صاحب کی سیرت کی جلد اول کے پروف دیکھے گئے۔ دوسری جلد کے پروفوں کا منتظر ہے۔ کتاب انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

نیاز مند

مہر

جواب - بہتر ہے کہ آپ دو تین دن کے لئے یہاں آئیں تو ان سوالوں کے زبانی جوابات مل جائیں۔

باسمہ سبحانہٗ

مئی ۱۹۵۵ء

حضرت مولانا۔ میں کل ایک مفصل عریضہ خان صاحب کی وساطت سے خدمت گرامی میں بھیج چکا ہوں۔ آج دوپہر کو لیٹے تو معمول کے مطابق سب سے پہلے آپ ہی کی یاد تازہ ہوئی۔ میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ عرفی کا ایک شعر آپ نے "غبار خاطر" میں کسی قدر بدل کر چھاپا ہے اور بدلا ہوا ٹکڑا اصل سے بہتر نہیں۔ اور فکر کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ اس میں مصلحت کیا تھی۔

شعر یوں ہے:-

من از ہیں درد گراں مایہ چہ لذت یابم
کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

لیکن غبار خاطر میں "درد گراں مایہ" کی جگہ "رنج گراں بار" چھپا ہے

یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ نے شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر کس جگہ تبصرہ لکھا تھا؟ آیا اس کا دیوان بہت اچھا ہے؟ آیا اس تبصرہ کا کوئی ٹکڑا آپ کے مسودات میں موجود ہے؟ لیکن اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ دہلی دوبارہ آ کر پوچھوں۔

والسلام علیکم

نیاز مند

مہر

جواب - ہو سکتا ہے کہ میرے حافظے میں وہی الفاظ ہوں جو میں نے لکھ دیئے۔ اگر آپ نے یہ دیوان عرفی دیکھا ہے تو وہی الفاظ ٹھیک ہیں۔

شرف جہاں قزوینی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری میں وقوعہ گوئی کے طرز کی بنیاد ڈالی۔ وقوعہ گوئی اس معاملے میں بولا جاتا ہے جس معنی میں اردو میں معاملہ بندی کہتے ہیں۔ اس کے مسودات ضائع ہو گئے، موجود نہیں ہیں۔

خان بہادر ظفر حسین خاں کی معرکۃ الآرا کتاب "الواح فلسفہ" چھپ گئی ہے مولانا نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتنا وقیع ہے!

"الواح فلسفہ میں آپ نے بعض مصطلحات ایسی استعمال کی ہیں جو غور طلب ہیں۔ آپ نے Resultant کے لئے معلولات استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ Resultant ریاضی کی مشہور اصطلاح ہے جس کے لئے صحیح عربی لفظ حاصلات ہے۔ Emergent کے لئے آپ نے خروجات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ خروج اس کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا میں نے الہلال کے زمانے میں اس کے لئے ظہور رفیعی کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن پھر میں نے اس کے لئے زیادہ موزوں عربی لفظ فلتات پایا جو فلتہ کی جمع ہے۔

Atom کے لئے آپ نے ذرہ استعمال کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن عربی کی پرانی اصطلاح جوہر فرد ہے۔

آپ نے Dilectic کے لئے کلامیات وجدلیات دو لفظ لکھے ہیں۔ کلامیات اس کے لئے درست نہیں ہوگا۔

Experimentalism کے لئے آپ نے اختیاریت استعمال کیا ہے۔ جو بھی لفظ استعمال کیا جائے اس میں تجربہ کا مفہوم آنا چاہیئے

آپ نے Mass اور Quantity کو مرادف قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے کمیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس کے لئے صحیح لفظ جرم ہے نہ کہ کمیت۔ الہلال کے مضامین میں میں نے اس کے لئے جرم ہی استعمال کیا ہے۔

آپ نے Platonic Ideas کے لئے افلاطونی اعیان کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ عباسی مترجموں نے اس کے لئے مثال کی اصطلاح استعمال کی تھی اور وہی صحیح ہے۔ اعیان کا عربی فلسفہ اور تصوف میں دوسرا مفہوم ہے۔

Response کے لئے آپ نے جوابی حرکت اور ردِ عمل دو لفظ لئے ہیں۔ ردِ عمل Reaction ہے Response کے لئے صرف جواب صحیح اصطلاح ہوگی۔

Self کے لئے آپ نے ذات اور نفس دو لفظ لکھے ہیں۔ مگر ذات استعمال کیجئے۔ نفس صحیح نہیں ہوگا۔ اگر Self کے لئے نفس استعمال کریں گے تو Nous کے لئے کیا باقی رہے گا۔ عربی فلسفے میں Noetic کے لئے نفسِ ناطقہ استعمال کیا گیا ہے Velocity کے لئے آپ نے حرکت کا لفظ لیا ہے۔ پھر آپ Movement کو کیا کہیں گے۔

Proton کے لئے آپ نے برقِ مثبت کی اکائی لکھا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تمام انگریزی مصطلحات جو ہمارے لئے سہل الحصول ہوں بجنسہٖ اختیار کر لینے چاہئیں۔ اردو میں Electron اور پروٹون ہم کہہ سکتے ہیں Pluralism کے لئے آپ نے کثرتیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ اسے مذہبِ کثرت کر دیجئے۔

. . . .

شری ویانند شرما کا سوال اور اس کا جواب

دہلی ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۰ء

مخدوم مولانا صاحب

معاصر "امروز" لاہور نے آپ کا مضمون "اسوۂ حسین" ماخوذ از "داستانِ کربلا" بشکریہ "نفیس اکیڈیمی" اپنے مورخہ ۱۴ اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ ایڈیٹر لکھتا ہے کہ ہم مولانائے موصوف سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ اس موقع پر مسلمانانِ کشمیر کو بھی یہی مشورہ دیں گے کہ وہ "ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کریں اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت نہ کریں جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت اور حقوق کی غارت گر ہو۔"

قطع نظر اس کے کہ معاصر ایسا کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا نظریہ کیا ہے۔ کیا یہ خدا کی بخشش ہیں جیسا کہ آپ کے مضمون میں درج ہے یا انسانی دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ مجھے راہ دکھا سکیں تو آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔

خادم

ویانند شرما

جواب:۔ جو چیز قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مساوات پر یعنی انسانی برادری و بھائی چارہ "پیغام خود سے اس میں زور دیا گیا ہے کہ اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ معاشرت یا نسل کی بنا پر انسان کا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے افضل ہو سکتا ہے۔

مساواتِ انسانی کا یہ تصور فطری ہے اور خدا کی بخشش ہے مگر اس کے حصول کی کوشش یا عدم سعی یہ انسانی دماغ پر منحصر ہے۔ فطرتِ صحیح اسے راستہ دکھا چکی ہے اس پر چلنا نہ چلنا اس کے اختیار میں ہے۔

مکتوب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد

۲۳۔اگست ۱۹۵۶ء

مشفقی و محترمی

تسلیم۔ آپ کے الطاف نامہ مورخہ ۱۴۔ اگست کا بے حد مشکور ہوں۔ حضرت مولانا کی خدمت میں تمام علمی دنیا اور خصوصاً دائرۃ المعارف کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش فرمایئے اور عرض کیجئے کہ آپ کے عہد اور آپ کی سرپرستی میں جو کام ہو رہے ہیں وہ ابدالآباد تک زندہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ آپ کو ان کا اجر دے گا اور یہ کارنامہ تاریخ ثقافت عالم میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ دائرۃ المعارف کی سرپرستی درحقیقت ہمارے مشاہیر کی قدردانی ہے۔ کتاب الہند جس کا ملنا مشکل تھا وہ بھی حضرت مولانا کے فیض سے عالمِ تحقیق کو مکرر دستیاب ہو جائے گی اور ہندوستان اور بیرونی کا نام پھر روشن ہو جائے گا۔ پہلے پیوف مکرر ملفوف ہیں۔

میری شخصی استدعا مورخہ ۱۴۔ جولائی ۱۹۵۶ء کے متعلق کیا کارروائی عمل میں لائی گئی کچھ پتہ نہیں چلا۔ دو حرفی جواب سے سرفراز فرمایئے کیونکہ یہاں حالات بہت جلد تبدیل ہو رہے ہیں۔

منتظر کرم

محمد نظام الدین

جواب:۔ کتاب الہند کی طباعت و اشاعت یقیناً ایک علمی و ثقافتی کام ہے دائرۃ المعارف کی شہرت ہندوستان کی شہرت ہے۔ حیدرآباد ایکشن کے زمانے میں متعدد استفسارات بیرونِ ہند سے اس ادارے کی سلامتی کے متعلق وصول ہوئے تھے۔ آپ کے ذاتی مسئلہ پر غور ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر نور حسین صاحب سیالکوٹ (پاکستان) سے مکتوب

سیالکوٹ۔ ۴ ستمبر ۱۹۵۵ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ایک مدت سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ چند ایک مسائل ہیں جو میرے لئے ایک مدت سے الجھن بنے ہوئے ہیں۔ آج میں آپ ہی کی خدمت میں ان کے حل کرنے کے لئے رجوع کر رہا ہوں کیونکہ میری دانست میں ان مسائل کی دشواریوں کو طے کرنے کی اہلیت سرزمین پاکستان و ہند میں آپ کی ذات کے بغیر اور کوئی نہیں رکھتا۔ لہٰذا آپ ہی کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیتیں بے حد ہیں۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اور کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

اسلام کی ہمہ گیر سادگی اور یہ کہ یہ فطرت کا مذہب ہے۔ مسئلہ توحید اور اس کے بعد محض عمل صالح پر زور۔ یہ سب کچھ نہایت عمدہ اور قابل قبول۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ تاریخ کے اعتبار سے (قرون اوسطیٰ کے شاندار زمانہ سے قطع نظر) سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں کم از کم بارھویں صدی عیسوی یا خلافت عباسیہ کے خاتمہ کے بعد اسلام کی تمام ترقی کا دارومدار ایسا مسدود ہوا کہ پھر نہ کھلا۔ اور آج تک پیروان اسلام ذلت و ادبار میں مبتلا ہیں۔ میں اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہوں کہ اسلام اور پیروان اسلام دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور دونوں کو خلط نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ چیز معمہ بن چکی ہے کہ اتنی اچھی تعلیم کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے اس قدر پست ہے اور کیوں۔ تہذیب و تمدن، اقتصادی مرفہ الحالی، خدمت علم و سائنس، وراثت فی الارض، انسانیت اور اس کے جملہ خصائص انفرادی اور اجتماعی، ان سب چیزوں میں مسلمان سب قوموں سے پیچھے ہیں اور بظاہر کوئی صورت اصلاح حال کی دکھائی نہیں دیتی۔ مغربی ممالک کی نظروں میں مسلمان محض ایک مذاق بن کے رہ گئے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسری اقوام کو دیکھا جائے تو وہ ہر چیز میں ہم سے پیش پیش ہیں۔ خدمت خلق، راستبازی، بلند اخلاق ان چیزوں کا ... ان کے اندر اس قدر دور دورہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ علم و فن کے ... ہم سے پیش پیش ہیں۔

... سلسلے میں ایک چیز نے بظاہر میری رہنمائی ضرور کی ہے اور وہ یہ کہ ... نے اس دنیا میں آج تک سر اٹھایا مثلاً بابل و کلدانیوں کی تہذیب، ہندوستان میں آریاؤں کی تہذیب، مصریوں کا عروج و ترقی، یونانی اور رومن تہذیبیں۔ یہ سب اپنے اپنے زمانے میں انتہائی عروج پر پہنچیں اور پھر ان کا زوال ایسا آیا کہ پھر نہ ابھریں۔ تو کیا فطرت کا یہ ازلی قانون تو نہیں کہ جو قوم یا تہذیب ایک انتہائی بلندی پر پہنچ جائے اس کی پستی لازمی اور یقینی ہے۔ اور پھر وہ نہیں ابھرتی۔ بجنسہٖ کہیں اسلام کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کے ماتحت تو ایسا نہیں ہو رہا۔ لیکن قرآن حکیم میں بھی تو لکھا ہے کہ ھُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔ تو اس کے ماتحت اس دین کو سب پر غالب ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔

اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ جو ذلیل اور پست حرکتیں ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حالی مرحوم جس قدر برائیاں گن گئے تھے ان سے کئی گنا زیادہ اب موجود ہیں۔ آج کے مقابلہ میں شاید وہ دور بہتر تھا۔ شرافت، دیانت، تحمل، وسعت قلبی، ایثار، رحم، سچائی، عدل و انصاف، ان سب خصائص سے ہمیں دور کا بھی تعلق نہیں۔ نفرت، خود غرضی، ظلم، بددیانتی، تنگ نظری یہ سب ہمارا شیوہ بن چکی ہیں تو خدارا بتلائیے کہ ایسا کیوں ہے اور کیا کوئی اصلاح حال کی امید ہے۔

جو میرے ظنون و شبہات ہیں وہ یہ ہیں کہ قرآن و سنت کے صحیح اور سیدھے راستے کی موجودگی میں مسلمانوں کی تمام عالم اسلام میں یہ حالت کیوں ہے۔ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی حالت شاید ہم سے بھی زیادہ زبوں ہے تو آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا نعوذ باللہ اسلامی تعلیم میں وہ دلکشی ختم ہو گئی؟ اور محمد علی باب کے مطابق کہ ہر مذہب ایک ہزار سال کے بعد اپنی اصلی ماہیت کھو بیٹھتا ہے یہی اطلاق ہمارے اوپر تو نہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کا ذکر آپ نے تذکرہ میں جو کیا ہے وہ تو مایوس کن نہیں۔ لیکن آخر امید کی کرن کب روشن ہوگی۔ ان امور کا جواب دیجئے اور ضرور وقت نکالیے۔ میں پرانا نیازمند ہوں اور تسکین قلب کی تلاش میں ہوں۔ آپ کا ادنےٰ نیازمند

نور حسین

جواب:۔ اسلام دین فطرت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خود اسلام کی تعلیم کو پرکھا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ لوگوں میں بے عملی کیوں ہے اس کی ذمہ داری اسلام کی تعلیم پر نہیں ہو سکتی

لوگوں کی بدعملی پر ہے۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اس تعلیم کے جو کامیاب نتائج نکلے وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور اب لوگوں کے بدعملی کے نتائج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔

غلامی کے متعلق ایک استفسار

رائچی چرچ روڈ
۴۔ اگست

ذوالمجد والکرم حضرۃ مولانا محترم! ادام اللہ بقائکم ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے بصورت تحریر حاضر خدمت ہوا ہوں۔

آپ نے اپنے ترجمان القرآن میں " ما ملکت ایمانکم " کے لئے نکاح ضروری قرار دیا ہے اور بغیر نکاح وطی ناجائز ہے اور اس کی وضاحت آپ نے دوسرے حصہ سورۂ مومنون کے نوٹ کے اندر کی ہے کہ " قرآن کے نزدیک اتحاد تناسلی کا جائز طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ازدواج کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا ناجائز ہوگا خواہ کسی شکل اور کسی نوعیت کا ہو۔" حالانکہ آیات قرآنیہ سے اس کا صاف طور سے ثبوت نہیں ملتا ہے ہاں، اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ وہ لونڈی کسی دوسرے کے ملک میں ہو تو مالک سے اجازت لے کر اس کا نکاح کیا جائے گا جیسا کہ آیت شاہد ہے ' فانکحوھن باذن اھلھن ' اور دوسری آیت ' وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ' سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو تو دوسرے سے اس کا نکاح کر دے۔

اور سورۂ مومنون میں " الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم " سے تو صاف طور سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بغیر نکاح لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے کیونکہ آیت ازواج اور ما ملکت ایمانھم کے حق وطی میں ظاہر ہے اس لئے کہ عقد مناکحت کے بعد ملک یمین بھی ازواج میں داخل ہے تو پھر دوبارہ ملک یمین کا تذکرہ کیوں ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد حرہ بیوی اور لونڈی سے وطی جائز ہے۔ اس آیت کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری و عزیزی و قاضیخان وغیرہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ملک یمین سے بدون نکاح وطی جائز ہے اور اس دور حاضرہ میں حجاز کے بادشاہ سلطان ابن سعود کا بھی اسی پر عمل ہے اور ہمارے شہر کے علماء بھی قرآن و حدیث اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں اسی کو ثابت کرتے ہیں کہ شرعی لونڈی بغیر نکاح وطی جائز ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ صحیح مسئلہ کس کو سمجھوں۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت قرآن و حدیث و واقعات کی روشنی میں فرما دیجئے تاکہ پیدا شدہ شکوک و شبہات رفع ہو جائیں۔

راقم نیازمند
محمد نعیم

جواب۔ مختلف موقعوں پر مختلف نوعیت کی تصریحات ہیں۔ لڑائی کے قیدیوں کی نسبت عام رواج یہ تھا کہ وہ لونڈی غلام بنالئے جاتے تھے۔ اسلام نے ابتدا میں رحم و شفقت کے احکام دے کر اس رسم کے نتائج کو کم کیا اور پھر سورۂ محمد کی آیت " فاما منا بعد واما فداء " نازل کرکے اس رسم کو بھی بند کر دیا۔ البتہ اس سے پہلے جو لونڈیاں لوگوں کے تصرف میں آ چکی تھیں ان کے تعلق کو باطل نہیں کیا۔ سورہ مومنون میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سرمد شہید کے متعلق استفسار

۶۸۹

لاہور

گرامی قدر جناب!

السلام علیکم۔ قافلے چلتے رہیں گے اور انسانی فکر میں بھی ترقی رونما ہوتی رہے گی اور چند ایسے انسان بھی قرطاس عالم پر ابھریں گے جو اوراق پارینہ سے زندگی حاصل کریں۔ مجھے بھی انہیں میں سے ایک فرض کر لیجئے۔

سرمد کی ذات، صفات اور ارشادات پر کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب " خون شہادت کے قطرے " نظر سے گزری تو دل نے کہا کہ آپ اس سلسلے میں میری معاونت کر سکیں گے۔ براہ کرم مجھے وہ کتب اور رسائل تجویز فرمائیے جن کا مطالعہ مجھے منزل مطلوب تک لے جائے۔

آپ کی عدیم الفرصتی کے باوجود جواب ملنے کا یقین رکھتا ہوں۔ فقط

آپ کا خیر اندیش
کرم الٰہی بدر

جواب۔ فارسی شعراء کے جو تذکرے ہیں اکثر میں مختلف حال موجود ہے۔ بجز شاہ کے تذکروں میں مراۃ الخیال میں کسی قدر تفصیل ملتی ہے۔ دبستان مذاہب میں بعض تفصیلات ملیں گی۔ نیز کتاب پیدائش کا فارسی ترجمہ بھی سرمد کی نگرانی میں ہوا۔

خواجہ غلام السیدین

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

مولانا آزاد کا ذکر کن لفظوں میں کروں اور جذبات کی یورش کو کس طرح دماغ کا تابع بناؤں! ان کی عظمت کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وقت تاریخ کی سنہری کسوٹی پر ان کے ہم عصر مثل میری شخصیت اور ان کے کارناموں کو پرکھے گا۔ ہم لوگ جو ہمالہ کے دامن میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی بلندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا جن پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے، اس کے دل کی شورشوں کا جس میں لاوا کھولتا رہتا ہے، ان طوفانوں کی یورش اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں یا جواہرات کے ان خزانوں کا جو اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں! اس مختصر مضمون میں تو بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کی عہد آفرین شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دوں۔

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور اپنی خاص قدریں، خاص اصول، زندگی و بدی کے خاص سانچے ڈھالتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے جس کے بنانے میں مختلف قوموں، نسلوں، زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے، اور اس کا اٹوٹ سلسلہ ہزاروں برس سے قائم ہے۔ قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام مابہ الامتیاز قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں۔ جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی، جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن، ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد۔ اس ہند مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی ہے۔ انھوں نے مشرقی تہذیب، ادب اور علوم و فنون کے ماحول میں ابتدائی تربیت پائی، مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح اس کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ ان کی خلاق طبیعت نے اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی بہترین قدروں کو بھی اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین سنگم بن گئی۔ اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضعداری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرأت، انسان دوستی، عملیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس طرح ان کی ذات ماضی اور حال کے درمیان، مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک زبردست عالم دین تھے لیکن ملا کی تنگ نظری سے آزاد۔ فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی اس کی سطحی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکے۔ ان کا مسلک گویا یہ تھا۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد!

ان کے نزدیک مذہب، فلسفہ، سائنس، سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اس غرض کے لئے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو پورا فروغ دے۔ ان کی زندگی میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی، دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی کارفرمائی تھی۔ وہ ایک پختہ کار اور بیدار مغز سیاست داں تھے لیکن ان تمام ریشہ دوانیوں اور گھٹیا چالوں سے بلند، جن کے ذریعہ بہت سے سیاست کا کھیل کھیلنے والے اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی تھی لیکن اس کے لئے کبھی اشتہار بازی کے طریقوں سے کام

نہیں لیا۔ وہ کبھی عوام کی سطح پر نہیں اترے، بلکہ محبت اور سمجھداری کے ساتھ انھیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی اور جب کبھی وہ راستے سے بھٹکے اور مولانا کی طرف سے انھوں نے بدگمانی یا روگردانی کی، مولانا صراطِ مستقیم پر چلتے رہے اور علی الاعلان ہدایت کے فرض کو یکسوئی اور دل سوزی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ سیاست کے طوفان آئے، زلزلوں نے پہاڑوں کے ثبات قدم کو لڑکھڑا دیا لیکن یہ مردِ مجاہد، یہ کوہِ وقار مومن اپنی جگہ پر اپنے اصولوں پر، اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا اس شان کے ساتھ کہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، نہ مخالفوں اور بدباطنوں کی ملامت کا خوف اور شکوہ۔ ان کی دریدہ دہنی اور بدزبانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا تو اتنا کہا کہ "یہ کچھ عاقبت ناشناس ہیں" یعنی نہیں جانتے، نہیں سمجھتے کہ ان کی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔ اُن کے دل میں کینہ کے لیے جگہ ہی نہ تھی۔ انھوں نے کسی جگہ ظہوری کا ایک شعر نقل کیا ہے جو اُن کے قلب صافی کا نقشہ بھی کھینچتا ہے:

شد آشنائے سینۂ ظہوری پُر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

اُن کا پیغام قوم کے لئے یہی تھا کہ نیکی اور شرافت کا ساتھ دو اور برائی اور بے انصافی کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی رسی کو جو حق اور صداقت کی رسی ہے، جو سیدھا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ اور خود انھوں نے عمر بھر کبھی اس حبل المتین کو اس مضبوط رسی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں "اپنوں" کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی صحیح اور سچی بات میں "غیروں" سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لئے "اپنے" وہی تھے جو ان کے اصولوں سے متفق ہوں اور "غیر" وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں۔

قدرت نے انھیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے اور ان کا ناخنِ تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال وفتر کے کاموں میں تھا ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں اُلجھتے۔ موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملہ تک پہنچ جاتی اور وہ ایک واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل اتنا فراخ تھا کہ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا پورا بھروسا تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی برائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سُنا کہ فلاں "چھوٹے دل و دماغ کا آدمی ہے" یعنی ان کی ترازو میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت تھی!

انھوں نے جنگِ آزادی کے زمانے میں اس تحریک کی سرداری کی اور قید و بند کی مصیبتوں اور تنگ دستی اور پریشانی کی آزمائشوں کو شہد کا گھونٹ بنا کر پیا لیکن جب آزادی حاصل ہوئی تو انھوں نے اپنی ساری قوت اور توجہ اس بات پر وقف کر دی کہ قومی زندگی صالح بنیادوں پر قائم ہو۔ جب کبھی کوئی ایسا نازک موقع یا مشکل مقام آیا جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شاید مصلحت کی کشش انصاف اور دیانت داری پر غالب آجائے تو ان کی اصول پرستی، جرأت اور حق گوئی نے سدِ سکندری کا کام دیا اور مصلحت پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے حق شناسوں نے ان کو قوم کے ضمیر کا خطاب دیا تھا۔ یعنی اس میدان میں انھوں نے اس فرض کے بار کو اٹھایا تھا جو گاندھی جی، تمام دیتے تھے۔ ناواقف لوگ ان کو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور دعوتوں میں دیکھتے تو خیال کرتے کہ شاید مولانا آزاد اب سیاست کے مرکز سے دور ہو گئے ہیں۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ جب کانگرس آزادی کی جنگ کر رہی تھی مولانا اس کے ایک ممتاز رکن اور صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے۔ آزادی کے بعد انھوں نے اپنے لئے ایک دوسری شاہراہِ عمل معین کر لی تھی جس پر چل کر وہ ملک کی خدمت اور رہنمائی کر سکتے تھے۔ بے شک، ب وہ ایک لحاظ سے گوشہ نشین تھے۔ لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے لیکن ان کی انگلیاں قوم کی نبض پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کرنا چاہیئے۔ اس زمانے میں ان کی شان یہ تھی ؎

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!

اور سب کی رفاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے بنانے والے نے ان کو یاد کیا اور وہ اس کا نام لیتے لیتے اس کے حضور میں پہنچ گئے تو نہ صرف لاکھوں دلی والوں کی، بلکہ کروڑوں ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت امیر اور ضبط کے بندھن توڑ کر امنڈ پڑی اور باہمی فرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموش اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جمِ غفیر میں جو ۲۲۔ فروری کو ان کے مکان کے گرد جمع تھا ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سُنا اور اسے تحسین کیا معلوم ہے "آزاد نے تو بادشاہ کی ہے بادشاہت" ایک معنی میں یہ بالکل سچ ہے۔ وہ دل اور دماغ کے بادشاہ بھی تھے اور حکومت کی پالیسی کے بنانے اور

ڈھالنے میں۔ ان کا یہ عقیدہ تھا اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے پیش نظر اس بڈھے کا یہ قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے

لیکن یہ بادشاہ جس میں ایک طرف انتہائی خودداری اور خودی کا احساس تھا جو کبھی کسی قوت کے سامنے سر نہ جھکاتا تھا، ایک فقیر بھی تھا۔ فقیر اقبال کی اصطلاح میں یعنی

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اسی وجہ سے اس کے آن قصر و شہی کے ذائقے سے ان جانے تھے اور دل بیزار اٹھتا تھا

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

اس فقیر کے پاس متاع دنیا میں سے بہت کم تھا، نہ مال نہ دولت، نہ جائداد نہ سرمایہ۔ دنیا کی زندگی کی وہ پابندیاں جو دل میں کمزوری پیدا کرتی ہیں۔ اس میں بے نیازی کی ایک خاص شان تھی اور نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کسی انجمن، کسی درسگاہ، کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ شاید ایک دو کے سوا کسی یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری قبول نہیں کی۔ تاریخ پیدائش تک پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو منانے نہ لگیں۔

مولانا آزاد میں جہاں ایک شاہانہ شخصیت اور انداز فکر و عمل پایا جاتا تھا وہاں ان کے دل میں عام لوگوں، غریبوں اور سماج کے ستائے ہوئے طبقوں کے لئے خاص ہمدردی اور گداز تھا جس کے افسانے زبان خلق مدتوں تک سنائے گی۔ لیکن اس کی ایک انوکھی جھلک آپ کو اس انتساب میں دکھائی دے گی جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنے علمی اور مذہبی شاہکار "ترجمان القرآن" کے لئے لکھا تھا۔ اس زبردست تصنیف کو انھوں نے نہ کسی رئیس کے نام منسوب کیا نہ عالم کے نہ کسی دوست کے نہ عزیز کے بلکہ ایک غریب گمنام اجنبی کے نام جو ان کے پاس ایک دوسرے دیس سے سینکڑوں میل چل کر علم اور دینی ہدایت حاصل کرنے آیا تھا۔

"غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے، میں رانچی میں نظربند تھا عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"
"ہاں جناب میں بہت دور سے آیا ہوں۔"
"کہاں سے؟"
"سرحد پار سے۔"
"یہاں کب پہنچے؟"
"آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرے پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"
"افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"
"اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

کیسا شاندار اور اثر آفریں اعتراف ہے طلب صادق کا، علم کی پیاس کا، مذہب کی سچی لگن کا، خواہ وہ ایک بوسیدہ کمبل ہی میں ملبوس ہو۔

اس مرد مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا، وجاہت ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی، دماغ کی تابانی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی، دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا سب کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حدوں کا پتہ نہ چلے، تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی ہی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا اور لفظوں سے کام لیا شعلہ اور شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا۔ مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں

درمیان وہ دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکر حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے ---- یہ تھے مولانا آزاد --- ایسا دوسرا کہاں سے آئے گا؟ بقول حالی

ملک یکسر ہو گیا ہے بے آئیں　　اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک ذات پہ شیرینی　　ڈھونڈتے کیا ہو سیب نخل میں
لب جادہ بیاں ہوا خاموش　　ذوقِ گل واہ ہے کیوں گلستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی　　شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

آخر میں ایک قطعہ تاریخ سن لیجئے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات پر لکھا ہے اور جس کے آخری شعر میں امید کا وہ پیغام ہے جو دکھ اور مایوسی کی موجودہ کیفیت میں ہماری ہمت بندھاتا ہے

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیش کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد

آہ بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغ ارم میں ہے آزاد!
رحلت کی تاریخ تری نکلی منہ سے فوراً یوں کہہ
دل پہ آہ ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد!

۱۹۵۸ء

اتنے میں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھا اب بھی ہم میں ہے آزاد!
روح فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد!

یہ تو تھی جگ بیتی، آپ بیتی کوئی کیونکر سنائے سوائے اس کے۔

گفتم: نیست کہ بر غالب ناشاد چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت!

سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

ہوا غروب وہ مہرِ کمالِ علم و ادب　　قمر "ہلال" کی صورت تھا جس کا حلقہ بگوش
بلند جس نے کیا تھا نشانِ آزادی　　عمل میں گاندھی و نہرو کے تھا جو دوش بدوش
بنایا ملک کو آزاد تھا جو نام آزاد　　جگا چکا جو ہمیں، سو گیا وہ صاحبِ ہوش
بساطِ علم و فراست پہ اہلِ بیت و کشاد　　تھے اس کے سامنے شاگردوں کے حلقہ بگوش
نہاں تھے لاکھ تکلم سکوت میں اس کے　　بتائے مشک کی خوشبو نہ جیسے مشک فروش
وہ سو رہا ہے بظاہر فنا کے دامن میں　　پر اس کا نام بقا سے رہے گا ہم آغوش
زبان موجۂ سیلاب تھی دمِ تقریر　　کہ جس طرح ہو سمندر میں وقتِ طوفاں جوش
جہانِ علم و ادب میں جو چھایا سناٹا　　تو آئی غیب کی جانب سے یہ ندائے سروش

خبیر مصرعِ تاریخ لکھو ہجری میں
اداس اداس ہے مجمع ابوالکلام خموش

۱۳۷۷ھ

ظفرحسین خاں

ابوالکلام بہ حیثیت انشاپرداز

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت اپنی جگہ ایک انجمن تھی۔ وہ ایک بڑے عالم بھی تھے اور انشاپرداز بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی۔ لیکن غور کیجیے تو اُن کی شخصیت کا مایۂ خمیر ادب ہی تھا اور وہی اُن کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ اُن کی سیاسی تقریریں، اعلیٰ ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔ اُن کے فلسفیانہ افکار صاف اور ستھرے ادبی پیرایۂ بیان سے آراستہ ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو ایسا سریع الفہم بنا دیتے ہیں کہ معمولی سے معمولی آدمی کو بھی غلط فہمی کا امکان نہیں رہتا۔ اسے ادبی اعجاز نہیں تو کیا کہئے؟ مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازہ سے داخل ہوئے۔ الہلال اور البلاغ بہترین سیاسی رسالوں سے پہلے بہترین ادب پارے تھے۔ جنھوں نے قوم کے دل میں جگہ کرکے مولانا کو لیڈروں کی صفِ اوّل میں کھڑا کر دیا۔ غرضیکہ ہر شعبۂ حیات میں مولانا کی عظمت، اُن کی انشاپردازی کی رہینِ منت ہے۔ اور یہی کہنا چاہیے اُن کا اصلی جوہر ہے۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں شرفِ نیاز سب سے پہلی بار [illegible] میں حاصل ہوا۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور مولانا کی تحریروں کی بدولت سے زبان آشنا تھی۔ اُن سے ملنے کا کمال اشتیاق تھا کہ سنا مولانا لکھنؤ آئے ہیں اور سول ملٹری ہوٹل میں قیام ہے۔ سول ملٹری ہوٹل، اس زمانہ میں لکھنؤ کا بہترین فیشنیبل ہوٹل تھا جو مغربی انداز پر ایک یوروپین مہتمم کی نگرانی میں چلتا تھا۔ مولانا اور سول ملٹری ہوٹل! یہ ایک اجتماعِ نقیضین سا معلوم ہوتا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی میرے ہم مکتب تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے پہلے سے رسم و راہ رکھتے تھے۔ چناں چہ میں نے انھیں کو اپنے تعارف کا واسطہ بنایا۔ ہم دونوں جب اُس کمرہ کے برآمدہ میں پہنچے جس میں مولانا مقیم تھے تو کمرہ کے اندر سے میں نے ایک "کلین شیو" نوجوان کو برآمد ہوتے دیکھا۔ مولانا عبدالماجد نے میرا تعارف کرایا۔ میرے ذہن میں مولانا آزاد کا جو تصور تھا اس پر یہ دوسری ضرب تھی۔ یعنی یہ کہ وہ کم و بیش ہم لوگوں کے ہم عمر سے تھے اور ابھی ڈاڑھی مونچھ ان کے چہرے پر برآمد نہیں ہوئی تھی۔ مولانا ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور چائے کے ساتھ اپنی شیریں تقریر سے جو ہم لوگوں کی ضیافت کی اُس کا ذائقہ حافظہ میں اب تک محفوظ ہے۔ واقعاتِ حاضرہ پر ہر خیال کے اظہار کے لئے، بہت سے بہتر الفاظ و فقرات کا انتخاب، برجستہ مناسب حال اشعار کا استعمال؛ غرضیکہ وہ کالج کے دو نوجوانوں کے ساتھ معمولی بات چیت نہ تھی بلکہ ادبیاتِ عالیہ کا ایک کلاسیکل نمونہ تھا۔ اس قدر بے پناہ قوتِ بیان کا مظاہرہ دیکھنے کا اتفاق مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مشہور عالم اطالوی فلسفی کروچے نے اپنے "جمالیات" میں ماہرِ فن کے کمال کا پیمانہ قوتِ اظہار ہی کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑے سے بڑے مدعیانِ فن کے حواس اس وقت درست ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے "کمال" کے اظہار پر مجبور ہوتے ہیں، چنانچہ کروچے کا کہنا ہے کہ کسی مدعی فن کے امتحان کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ اس سے کہئے کہ ذرا اس گیت کے دو بول تو گا دیجئے یا یہ پنسل حاضر ہے اس سے کوئی نقش کھینچ کر اپنے وارداتِ قلب کا ذرا اظہار تو فرما دیجئے۔ "قوتِ اظہار کی اس جانچ سے ذرا کی ذرا میں اُن کے کمال کی پول کھل جائے گی۔ اور معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

قوتِ گویائی

مولانا کی قوتِ اظہار و بیان کے نمونے ان کی ہر تحریر میں ہر قدم قدم پر بغیر کسی تجسس کے ملتے ہیں چنانچہ "تذکرہ" کے چند ورق الٹتے ہی مولانا کی یہ تحریر سامنے آجاتی ہے:

"وہی دنیا جس کے میکدۂ فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے، اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دیتی تھی اب اس کا گوشہ گوشہ، چپہ چپہ، ہشیاری و بینش کا مرقع تھا۔ بصیرت و معرفت کا دبستان تھا۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاکِ پامال نے اُڑ اُڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بار بار اُترنا پڑا تا کہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھلنا پڑا تا کہ فضاء آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے باند تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے، سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اتار دیئے، سارے پردے چلمن ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں دعوتیں بھری تھیں، سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لئے دراز تھے، پاؤں کو پکڑا تو سازِ ہستی کا طنبورہ نکلا، بجلی کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا ایک تبسم آشکارا نکلا، ہوا کے جھونکے تھپیڑے بن آ گئے مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا۔۔۔۔ غرضیکہ ہمت خوابیدہ جاگ اٹھی اور دل رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے سامانوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ عالم آفاق و انفس میں جو کچھ ہے اُن میں سے کوئی نہ تھا جس کے ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو سب کی زبانیں گویا، سب کے اشارے آشکارا، سب کی سطریں اُبھری ہوئی تھیں۔ نہ کوئی لب بند رہا نہ کوئی جلوہ مستور، نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی، نہ کانوں نے سننے میں، چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے۔"

سخن عشق بدل دوز و لب را مکشا

سر این شیشہ فرو بند کہ باشد نخورند" (صفحہ ۳۰)

یا پھر کمال ایجاز کے ساتھ ایک اہم حقیقت کا اظہار ان چند لفظوں میں سمو لیجئے:۔

"غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اُس کے احساسات کا بھی کچھ عجب حال ہے تیس برس کی مدت ہو یا تیس دن کی۔ مگر جب گذرنے پر آتی ہے تو گذر ہی جاتی ہے۔ گذرنے سے پہلے سوچئے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیونکر کٹے گی؟ گذرنے کے بعد سوچئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گذر چکا وہ چند گھڑیوں سے زیادہ نہ تھا۔" (غبارِ خاطر صفحہ ۲۹)

زباں دانی

جرمنی کے مشہور عالم شاعر و ادیب گوئٹے کا قول ہے کہ اگر انسان دوسری زبان نہ جانتا ہو تو وہ اپنی مادری زبان کو بھی سلیقہ سے استعمال نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کی اس حیرت انگیز قوتِ گویائی کا باعث اُن کی متعدد زبانوں سے واقفیت ہو۔ عربی اور فارسی ادب پر تو اُن کو عبور حاصل تھا ہی۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی خوب جانتے تھے اور آخر الذکر دونوں زبانوں کی کلاسکی کتابیں اکثر اُن کے زیرِ مطالعہ دیکھی گئی ہیں۔ پھر قدرت سے حافظہ ایسا زبردست پایا تھا کہ ایک بار جو پڑھ لیا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ مولانا کو عربی، فارسی، اُردو کے ہزاروں شعر ازبر تھے۔ غبارِ خاطر میں فرماتے ہیں:۔

"معلوم نہیں ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی۔ گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی۔ جیسے اُسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کے واردات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح اُبھر آئیں گے کہ معلوم ہو گا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ کتاب یاد آ جاتی ہے کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعیین کہ مضمون ابتدائی سطروں

تھا، یا درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں، نیز صفحہ کا رُخ کہ بنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی حسبِ معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا۔

کم نہ ام در قیمتم افزوں شمارست
گوہرِ تر پیشتر از باغ دیدہ ام

ساتھ ہی یاد آگیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے جو اواخر عہد اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے عہد تک زندہ رہا۔ آفتاب عالم تاب میں نظر سے گزرا تھا۔ غالباً بائیں طرف کے صفحہ میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے۔ پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اسے کھولا ہو۔" (صفحہ ۱۰۹ تا صفحہ ۱۱۰)

اسالیب بیان

اسی طرح مشرقی اور مغربی فلسفہ کے مسائل اُن کے ذہن میں محفوظ تھے جن پر مخصوص صحبتوں میں پُر لطف محاکمہ کرتے تھے۔ ادب لطیف ہو یا فلسفہ، سیاسی بحث ہو یا مذہبی مسئلہ اور پھر تحریر ہو یا تقریر ہر جگہ اُن کی "ابو الکلامی" کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع بحث کی نوعیت کے اعتبار سے مولانا کا اسلوب بیان فی الجملہ بدلتا ہے۔ فلسفیانہ مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کا اسلوب بالعموم صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ ایسی تحریروں میں شاذ و نادر شعر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جیسا اوپر اشارہ کیا گیا اُن کی ذہنی تعبیر میں ادبیانہ صورت ہمیشہ مضمر پائی جاتی ہے جو ذرا سے غور کرنے سے نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ خالص ادبی تحریرات میں جو استعارہ و تشبیہ تھا وہ فلسفیانہ تحریروں میں تمثیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مولانا کی منطق اکثر و بیشتر تمثیلی ہوتی ہے استقرائی یا قیاسی نہیں۔ وہ اپنے تمثیلی استدلال سے مشکل مباحث اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ بایدو شاید، استقرا اور قیاس کی کاوشیں ان کی تمثیل کے سامنے پانی بھرنے لگتی ہیں۔ ایک اچھوتی تمثیل کی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یہی حال رہا جو بار بار کے تجربہ ہم نے قیاسات آتنبلا و تنبیہ کے آج نظر آ رہا ہے تو کچھ عجب نہیں کہ مسلمان مسجد کا دروازہ کھولنے، اذان دینے، نماز پڑھنے اور رمضان کا روزہ رکھنے کے لئے بھی گورنمنٹ کی اجازت اور رضا کے منتظر رہا کریں گے اور جمعہ کے دن خطیب منبر کے سامنے ہمہ تن انتظار ہو کر کھڑا رہے گا کہ شملہ سے تار آجائے تو خطبہ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو۔۔۔۔"

(البلاغ ۹ نومبر ۱۹۱۵ء)

مولانا کی انشاپردازی کے اجزاء ترکیبی۔ استعارہ، تشبیہ، تضاد

مولانا کے کمال انشاپردازی کا اصلی میدان ادب لطیف ہے۔ جس کے جوہر تازہ استعاروں، ابلتی ہوئی تشبیہوں کے ساتھ چبھتے ہوئے تضادات بھی ہیں جو ان کی نوشتہ جات میں بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ایک تضاد کی مثال ملاحظہ فرمائیے! استعارات و تشبیہات تو انہیں اقتباسات میں آپ نے دیکھے۔

"ہمارے تعلیم یافتہ دوستوں کا کچھ عجب حال ہے۔ ان کے پاؤں کو دیکھئے تو یورپ کی تابہ زانو کورانہ تقلید و عبودیت فکر کی زنجیریں پڑی نظر آتی ہیں۔ مگر چہرے کی طرف نظر اٹھائیے تو زبان کو ادعاء اجتہاد سے فرصت نہیں۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں عجیب منظر کا اور کیا تماشا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے کھڑا ہو اور عین اس وقت جب کہ اس کے پاؤں میں تقلید و استعباد کی زنجیریں پازیب کی طرح صدا دے رہی ہوں۔ اجتہاد فکر اور حریت رائے پر لیکچر دینا شروع کر دے۔" (البلاغ، ستمبر ۱۹۱۳ء)

ٹھیٹ ہندی کے الفاظ

چست فارسی ترکیبوں کے ساتھ مولانا اکثر ٹھیٹ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ایک خاص لطف دیتے ہیں۔ مثلاً

"مگر اس کی گرفتاری بھی گرفتاری اور اس کا الجھاؤ بھی الجھاؤ ہے؟"

"جس کو کیسی کیسی تمناؤں اور چاہتوں سے ہمیشہ سینے میں بچا کے رکھا تھا کہ کہیں ناسور بننے کی جگہ مندمل ہو جائے۔"

"الغرض توفیق الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھید ہیں۔"

"دل کی ٹیس اور ٹپک" وغیرہ وغیرہ۔

مآخذ و موثرات

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے ادب لطیف کو اگر "شعر منثور" کہا جائے تو

سیہ جانا ہوگا۔ شاعری کا کونسا کمال ہے جو ان کی نثر میں جلوہ افروز نہ ہو۔ کون سی صنعت ہے جو ان کی تحریر میں نہ ہو۔ بس وزن اور قافیہ ردیف سے عاری ہے۔ اس لئے آپ اسے نثر کہنے پر مجبور ہیں۔ ایسی نثر جس پر سیکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ مولانا کی انشا پردازی اگرچہ اپنے مخصوص رنگ میں یکتا ہے لیکن غور کرنے سے اس میں کچھ اثرات ملتے ہیں جو محمد حسین آزاد ، ظہوری ، عرفی ، غالب ، متنبی کی سخن آفرینوں اور ادیبانہ تراش خراش کے مرہون منت معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ مسلم ہے کہ مولانا آنادہر تقلید سے آزاد تھے۔ اور جابجا انھوں نے اپنی آزادروی کا اپنی تحریرات میں اظہار بھی کیا ہے۔

ظرافت

مولانا کی ظرافت اور عام ظرافت میں وہی فرق ہے جو کسی دہقانی کے کھلے بے تکا قہقہہ مارنے اور کسی متمدن و مہذب کے مسکرانے میں ہوتا ہے۔ مولانا کی ظرافت مہذب ، سنجیدہ اور شان دار ہوتی ہے جو عالموں کے لئے مخصوص ہے جس میں کوئی سوقیانہ یا بازاری پہلو نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت ذیل کی مثالوں سے آشکارا ہوگی۔ یہ دونوں اقتباس مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں جو جلسے لکھنؤ میں ہوئے تھے ان سے متعلق ہیں راقم الحروف ان جلسوں میں موجود تھا۔

"اتنے میں خبر آئی کہ (برآنز) کے ہاں ڈنر ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور ان نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہیئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے۔ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر این است وابرو این وناز وعشوہ این

الفراق اے ہوش وتقوے الوداع اے عقل ودیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ الطباسۂ قدیم وجدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذائے جزو سے معدہ خالی ہوجاتا ہے۔ جلسہ آٹھ کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور انگریزی کھانا باوجود سادہ اور بے تمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہوگی کہ صبح تک معدہ میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدہ سے۔"

(الہلال ، نشہ نیم شبی کا صبح خمار ۵ ، فروری ۱۹۱۳ء)

"جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جاسکے۔ چہرے جوشِ ہیجان سے سرخ ، گردن کی رگیں ابھری ہوئی ، گلے شدتِ شورش ہنگامے سے پڑے ہوئے ، ہاتھوں میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں ، اور پاؤں کو اضطراب رقص سے قرار نہیں ، منہ سے کف اڑ رہی تھی اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پونچھتے اور پھر کف الاتے۔ منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا۔ ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوشِ تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ اس لئے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔ یہ رقص مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا اگر (سرہنری اور بنگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پُرجوش نوجوانوں کی ایک کھیپ تو ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔"

(الہلال - ۲۳ مارچ ۱۹۱۳ء "نشہ نیم شبی کا صبح خمار")

چند تذکرات

مولانا کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ الہلال صرف اُن کی سیاسیات ہی کا آرگن نہ تھا۔ بلکہ کالج کے نوجوانوں کے اندر ادبی ذوق و بیداری پیدا کرنے کا بھی ایک موثر آلہ تھا۔ راقم الحروف کو بھی اردو پڑھنے لکھنے کا شوق الہلال کے مطالعہ ہی سے پیدا ہوا اور پھر الہلال ہی میں "ابوالاثر بہزاد" کے نام سے مضامین لکھنا شروع کئے جو مولانا کی اصلاح و تصحیح کے بعد الہلال میں شائع ہوتے رہے۔

ایک بات کا ملال مجھے تمام عمر رہے گا۔ الہلال جب اپنی اشاعت کے شباب پر تھا۔ مولانا نے مجھے اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ مگر اپنی ناتجربہ کاری سے میں نے تکمیلِ تعلیم کو ترجیح دی اور رنج حق یہ ہے کہ مولانا کی صحبت ایک ایسی جنس تھی جو ہر قیمت پر خریدنا چاہیئے تھی۔ اُسی زمانہ میں ، مولانا نے مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی بلایا تھا۔ جو صاحب الہلال کے ادارہ میں عرصہ تک رہے اور مضمون نگاری کی خوب

دودی۔ الہلال کے بہت سے مضمون ایسے ہیں کہ لوگ اب تک مولانا کے نتائج قلم سمجھتے ہیں۔ مگر دراصل وہ نقوشِ سلیمانی ہیں۔ مثلاً کانپور کی مسجد کے مسئلہ پر زبردست مضامین کا سلسلہ سیّد صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مولانا کے قلم کا اثر نہیں۔ مولانا کا اسلوبِ تحریر بلاشبہ ناقابلِ نقل ہے۔ لیکن الہلال کی بعض تحریریں جیّد سے جیّد ناقدفن کے سامنے رکھ دی جائیں اور پوچھا جائے کہ کون سی تحریر مولانا کی اور کون سی سیّد صاحب کی ہے تو بتانا مشکل ہوگا۔ مولانا کے مضامین اور مقالات جمع اور شائع کرنے والی کمیٹی میں ایسا شخص ہونا چاہئے جو سیّد صاحب کے مضمونوں کو مولانا کے مضمونوں سے الگ کر سکے۔

چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد جب مولانا پہلی بار پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے رام پور سے کھڑے ہوئے تو میرا قیام رام پور ہی تھا۔ الہلال سے سطحی ربط ایسا نہ تھا کہ یاد رکھنے کے قابل ہو۔ لیکن مولانا کو سب یاد تھا نہایت گرمجوشی سے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی اور واپس تشریف لے جانے کے دوڈیڑھ مہینے کے بعد پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کا خط آیا۔ عرض نہیں کر سکتا کہ صحبت کے چند دن کس لطف سے کٹے۔ اور الہلال کے دفتر میں شامل ہونے کی حماقت پر میں نے اپنے تئیں کتنی نفریں کی۔ مولانا شاکی تھے کہ دہلی میں کوئی ایسا ہم ذوق و ہم نوا نہیں کہ جس کے ساتھ گھڑی دو گھڑی بات کی جا سکے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اپنی افتادِ طبیعت کے اعتبار سے وہ سیاسی ہنگاموں کی کے تیز قمقموں اور شہرت پسندی سے نفور تھے۔ وہ پڑھنے لکھنے اور غور و فکر کے لئے گوشۂ تنہائی کے طالب تھے۔ لیکن ان شورشوں نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا اور اُن کی ساری زندگی انھیں ہنگاموں میں کٹی۔ مگر جیسا عرض کیا گیا اُن کی ہنگامہ انگیز سیاسی تقریریں بھی اعلیٰ ادب کا بے نظیر نمونہ ہیں۔ مولانا ہر رنگ میں ادیب ہی ہیں۔

> بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
> من اندازِ قدت را می شناسم

مولانا کی شخصیت کی نفسیاتی تعبیر کی بنیاد تخیّل پر ہے۔ تخیّل ہی نے اُن کے ادب میں ایک بے مثال رمزیت Symbolism پیدا کر دی ہے تخیل ہی اُن کے تر و تازہ استعاروں کا سرچشمہ ہے اور تخیل ہی اُن کے فلسفیانہ مباحث میں تمثیلی استدلال کے جیس میں ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں اُن کی جگر ادبیاتِ عالیہ ہی کا میدان ہے۔ دیگر میدانوں میں اُن کا ورود "ملے پر فرش" کا مصداق ہے۔

تصنیفات

مولانا کے مضامین سے رسالہ "ندوہ"، "الہلال" اور "البلاغ" مالا مال ہیں اور اُن کے جمع کرنے اور سلیقے سے کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی بڑی تصنیفات مثلاً ترجمان القرآن، تذکرہ، غبارِ خاطر وغیرہ کے علاوہ اُن کے بعض مقالے مثلاً "خونِ شہادت کے دو قطرہ" اِز سرِ نو مستقل طور پر طبع ہونے کے مستحق ہیں۔

موعظۃ و ذکریٰ

"... اگر پانی کہے کہ یہ میری کارفرمائی ہے تو آفتاب بھی چمک سکتا ہے کہ یہ اس کی حرارت کا معجزہ ہے۔ اگر دہقان مدعی ہو کہ اس نے بیج ڈالا تو موسم اُسے جھٹلا سکتا ہے کہ بغیر میرے آئے ہوئے محض تخم ریزی کیا کر سکتی تھی؟ مزدوروں نے ہل جوتا، کاشتکار نے بیج ڈالا، نگہبانوں نے رکھوالی کی اور موسم نے آبپاشی۔ ان میں سے ہر فریق دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں ہی اس لہلہاتے ہوئے کھیت کی وجود پذیری کی علت ہوں مگر وہ جو ان سب سے بالاتر قوت ہے کہتی ہے کہ تم سب ہیچ ہو۔ اگر قدرتِ الٰہی تمام اسباب و وسائل مہیا نہ کرتی تو نہ تو ایک بیج بار آور ہوتا اور نہ ایک سبز پتہ زمین پر نظر آتا۔"

(الہلال ۳ فروری ۱۹۱۳ء)

بسمل سعیدی

مولانا ابوالکلام آزاد

کم ہوا کرتے ہیں اس دنیا میں وہ مردانِ کار
زندگی اور موت دونوں کو ہو جن سے افتخار

زندگی اپنے محاسن خود بیاں کرتی نہیں
موت کرتی ہے محاسن زندگی کے آشکار

زندگی رکھتی ہے آغوشِ بقا میں کچھ نفس
موت کرتی ہے حیاتِ جاوداں سے ہم کنار

جب سماتی ہے یہ بڑھ کر وسعتوں میں موت کی
آبِ جوئے زندگی بنتی ہے بحرِ بے کنار

ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پر اس کا دوام
موت کر دیتی ہے جس کی زندگی کو استوار

زندگی جس سمت جب چاہے بدل سکتی ہے رُخ
موت ہی پر منحصر ہے زندگی کا اعتبار

اپنے زشت و خوب میں ہوتی ہے ساری زندگی
موت کے اک لمحۂ آخر کے زیرِ اختیار

زندگی ہے موت کے تابع مگر با ایں ہمہ
موت کا بھی ایک وضع زندگی پر ہے مدار

زندگی بھر کے خیالوں ہی کا ہے اک خواب موت
موت خود بھی زندگی کی ہوتی ہے آئینہ دار

بالعموم انساں کو موت آتی ہے حسبِ زندگی
ہے یہی کچھ فطرتِ عادل کا دستور و شعار

الفراق اے منزلت یابندۂ مرگ و حیات
موت کے راز آشنا محنت، زندگی کے شاہکار

تیری مرگ و زیست دو صفحے ہیں اک زنجیر کے
سلسلہ کردار کا تیرے ہے شمعِ کوہسار

تھا اُسی کا مقتضی تیرا عمل آغاز سے
زندگی جس موت پر منتج ہوئی پایانِ کار

ماتم انسانیت کرنے کو تیری موت پر
آج شاید آسماں پر ہوں ملائک سوگوار

سلسلہ جن کی فضیلت کا ہے تا خیر القروں
چند اُن اسلاف کا تھا آخری تو یادگار

موج اندر موج تھا اک قلزمِ زخّارِ فہم
علم کا تو ایک عالم تھا دیار اندر دیار

ماگزر تھا ید ترا اور ما صفت تیرا قبول
نہیٔ دانشِ دینِ برحق تیرا ترک و اختیار

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
تو مشیرِ عقل تھا اور تو جنوں کا مستشار

تیرے ہی نقشِ قدم پر پڑتے ہیں سب کے قدم
کس قدر رو ندی ہے تو نے عظمتوں کی رہگزار

دیکھ کر انداز تیری روح کے روزِ ازل
دی حیاتِ دُنیوی تجھ کو ابد نے مستعار

پھر بنائے پختگیٔ فکر تیری زندگی
اپنی ایک اک سانس میں رکھتی ہے قرنوں کا شمار

ہو سکا تجھ تک پہنچ کر مفتخر دَورِ جہاں
ہو سکے گا اور کیا فوزِ عظیم روزگار

تھا ترے آغاز عظمت ہی کا پرچم "الہلال"
تھی تری صبحِ نخستیں رُوکشِ نصف النہار

کس قدر ویران ہے مستقبلِ انسانیت
عالمِ تخلیق میں ہے اک خلا سے بے کنار

ہو سکے گی کیا تلافی اب غمِ مافات کی
حشر تک شاید رہے گی چشمِ ہستی اشک بار

تھی تری وضعِ تواضع میں سرافرازی کی شان
تیری افتادِ طبیعت میں ہمالہ کا وقار

پیشِ پا افتادہ رہتی تھی بہ صد عجز و نیاز
کجکلاہی سے تری، شانِ کلاہِ تاجدار

ناطقہ تیری طلاقت پر اگر قربان تھا
تھی طلاقت تیرے اندازِ خطابت پہ نثار

اس طرح منہ سے ترے جھڑتے تھے پھول الفاظ کے
خلد سے جیسے بہاروں کا گرے اک آبشار

جنبشِ ادنیٰ بھی تیرے کِلک کی اعلیٰ ادب
غازۂ روئے نگارش تیری خاطر کا غبار

نامۂ اعمال در دست آئیں گے جس وقت لوگ
حشر میں تو آئے گا تفسیرِ قرآں در کنار

ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا
ہمتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار

قلعۂ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صبح و شام
تھی جہاں شامِ خزاں تیرے لئے صبحِ بہار

تھا ترے نزدیک عینِ وقتِ آزادیٔ ہند
عہدِ افرنگی کا دَورِ قید و بند و گیر و دار

ہاں پریشاں کن تری جمعیتِ خاطر کو تھا
مسلمِ ہندوستاں کا افتراق و انتشار

تو امیرِ کارواں بھی تھا امام الہند بھی
ماسوائے ملک، ملّت کا بھی تھا تو ذمّہ دار

منتہائے عزم تیرا اس سے ظاہر ہے کہ تھی
ہمرہوں کی منزلِ مقصود تیری رہگزار

تھا جہاں تابِ فضیلت تیرا خورشیدِ حیات
اب حیات افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزار

سربرِ افلاک اس زمیں کو کر گئی کس کی نظر
زیرِ پائے مسجدِ جامع بنا کر یہ مزار

مسجدِ جامع! تری رفعت کا ضامن ہو گیا
علم و دیں کا اک ستوں، عزم و عمل کا اک منار

سر بہ سجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے
تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزار

اُس کے ذمّے تھے جو تیرے حق وہ پورے کر گیا
اب ترے ذمّے ہے اُس پر رحمتِ پروردگار

ثبت ہے عظمت پہ تیری مُہر توثیقِ دوام
یہ عظیم المرتبت تربت، فلک رفعت مزار

له پنڈت جواہر لال نہرو

محمد مجیب

انگریزی سے ترجمہ
مترجم۔ محمد شفیع الرحمٰن

تذکرہ

"ان اوراقِ پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوست عزیز کا اصرار تھا؟"

مولانا آزاد نے تذکرہ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے "اب وہ مُصر ہیں کہ اپنے حالات بھی قلمبند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے اُن کا اصل مقصد یہی تھا۔" تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اُس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک اشارہ ہے، ایک شخصیت ہے، ایک شعلہ اور جوش ہے، ایک الہامی واعظ کی قوتِ نطق، ایک بڑے دل کا گریہ و بکا، ایک المیہ کا حزنیہ نغمہ اور ایک فتح کا مسرت انگیز زمزمہ، وہ ایسی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصور کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا تصور جو فطرتِ انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

لیکن تذکرہ ایک انوکھی کتاب ہے وہ کتاب نہیں جس کی خواہش ناشر کو تھی۔ اُن کا مقدمہ بہت دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ وہ صریحاً ایسے مشاہیر پرست معلوم ہوتے ہیں جو تمام مشاہیر کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُن کی مولانا آزاد سے ۱۹۰۲ء میں واقفیت ہوئی۔ اُس وقت مولانا طالب علم ہی تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے ارتقاء کو دیکھا۔ جب مولانا آزاد نے 'الہلال' شائع کرنا شروع کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب کو ایک خاص اثر سے مسخر کر لیا تو مرزا فضل الدین کو خیال ہوا کہ اس کا عین وقت ہے کہ ایسی پُراثر شخصیت کے مداحوں کو اُن کے حالات سے واقفیت ہونی چاہیے۔ لیکن مولانا آزاد نے اُن کی خود نوشت سوانح عمری کی فرمائش کا مذاق بنا کر ٹال دیا۔

"کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح اور حالات نہیں لکھے گئے۔ اُن کو نظرانداز کر کے میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی۔" لیکن یہ بات قابلِ شکر ہے کہ مرزا فضل الدین مزاج کے معاملہ میں نکتہ رس نہ تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد پر مسلسل تقاضہ جاری رکھا۔ یہاں تک اُن کو یہ وعدہ حاصل ہو گیا کہ "ہر ہفتہ کچھ ملتا رہے گا۔" جو کچھ اُن کو ہر ہفتہ ملتا رہا اُس سے ابتداء میں مرزا فضل الدین نے یہ سمجھا کہ مولانا آزاد اپنی خود نوشت سوانح عمری کو اپنے خاندان کے حالات سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب مولانا آزاد موضوع سے بھٹکنے لگے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اصل مضمون پر آنا نہیں چاہتے تو مرزا فضل الدین اس پر مجبور ہوئے کہ اُن کو روکیں اور فرمائش کریں کہ مختصر لکھیں اور مطلوبہ موضوع پر لکھیں۔ لیکن مولانا آزاد کسی ہدایت کے پابند ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اصرار کے جواب میں لکھا: "میری طبیعت میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں، جمع کرتے جاؤ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔"

لیکن مرزا فضل الدین بھی مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ وہ رانچی پہنچ گئے اور مقیم ہو گئے۔ مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے۔ مرزا فضل الدین پندرہ سوال ایسے مقرر کر کے لے گئے کہ جن کے اندر مولانا آزاد کی زندگی کی تمام تفصیلات آ جاتیں۔ انھوں نے مولانا آزاد سے ان سوالات کے بالتفصیل جوابات کا اصرار کیا لیکن مولانا آزاد نے اپنی شخصیت کو شاعرانہ اشارات کے مزیّن پردے کے اندر چھپا لیا اور اپنے وجود کو گویا ایک روحانی مبہم بنا لیا اور اُن کی مادی زندگی ایسی ہو گئی کہ موضوعِ کلام سے خارج ہو گئی۔ مرزا فضل الدین

گیا ہوتا تو وہ ناکامیاب رہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے جیسی سوانح عمری لکھی ہے ایسی نہ لکھی جاتے تو کس قدر غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہے

تذکرہ دو جلدوں میں لکھا جانے والا تھا۔ مرزا فضل الدین کی اصل متن کی تقطیع بڑی اور طویل حاشیوں کی کاٹ چھانٹ بھی اس کو مختصر نہ کر سکی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسری جلد کا شائع ہونا بہت بعید ہے تو انھوں نے خود نوشت سوانح عمری کا متا ہر پہلی جلد کے ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا۔ کوئی کتاب بمشکل ناشر کی خواہش کے اس قدر خلاف ہو سکتی ہے جتنا کہ تذکرہ ہے اور ایسا بھی شاذ ہی ممکن ہے۔ کہ کوئی مصنف جس نے اپنے تخیل اور قلم کو آزاد رکھا ہو اور ترتیب اور تعلیل استدلال کا لحاظ چھوڑ دیا ہو۔ اس طرح ناشر کے دام میں آگیا ہو کہ وہ مسودہ پر نظر ثانی نہ کر سکے، حوالوں کی جانچ نہ کر سکے اور پروف بھی نہ پڑھ سکے۔ جب دو ثلث کتاب چھپ چکی تو مولانا کو اطلاع کی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے بے اعتنائی سے کہا "لوگوں نے اپنی دلجمعی اور فراغ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنی پریشان خاطری اور پراگندگی طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے۔" یہ غیر محدود آمد ہی ہے جس نے تذکرہ کو اختصاص کا ایسا موثر بیان اور مذہبی اور اخلاقی مسائل کا اس قدر پُرجوش مذاکرہ بنا دیا ہے اور یہ اس ہی سبب سے ہے کہ اس سے مولانا آزاد کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ تذکرہ واقعی موضوع نہیں ہے۔۔۔ حمایتِ حق ہے جس کی تکمیل کے لئے تبحرِ علم و فضل اور الفاظ پر پُر زور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرزِ بیان سے کارفرمائی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سے بھی واقف ہیں کہ کن بیانات کی کمی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ بالارادہ ہیں اور ان کا مقصد ان کے موضوع کی زیادہ موثر وضاحت ہے۔ اُن کو اس کا بھی یقین ہوگا کہ بیانات میں جو غلو انھوں نے اپنے ذوق سے کیا ہے وہ اک دلآویزی ہے اور ناظرین کو مسحور کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتداء میں جہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اس استدلال پر ختم کرتے ہیں کہ خاندان سے آدمی نہیں بنتا۔ اور آخر میں تتمہ میں وہ اپنی "سوانح عمری" لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت تذکرہ کو کما حقہٗ سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس کو اختتام سے شروع نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف اُن کا اندازِ فکر واضح ہوگا بلکہ اُن کا زورِ بیان، روانی، اُن کی اشاریت، اُن کی اُردو زبان کے زمین و آسمان کی خداوندی بھی وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی قوت ہے اور اُس تجلی کا نتیجہ ہے جو اس دُنیا کی روشنی سے نہیں ہے۔ "تذکرہ عمیق روحانی کیفیتِ مزاج کی تخلیق ہے اور اُسی ہی کیفیتِ مزاج کے اثر میں پڑھا جانا چاہیئے۔

"یہ غریب الدیار عہد، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، و نمک پروردۂ ریش، خمیرۂ تمنا و خراب حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو با بی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ ہجری میں ہستی عدم سے عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات منتہم، الناس نیام، اذا ماتو فانتبھوا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا۔ اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا "جوان بخت و جوان طالع، جوان باد" لکن اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی ہے۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے دم لینے اور ستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزلِ مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی اور منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا تھا اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ بدلی۔ راہ دور اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سر و سامان کار ناپید، وقت جا چکا اور ہر آن و لحظہ کاروانِ مقصود سے دوری اور منزلِ مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چُستی واپس بھی مل جائے تو بھی وہ دولتِ وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لُٹ چکی؟ اور قافلۂ امید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا؟

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ہماری فیروز بختی و جوان طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ۔ اصل فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے۔ اور جوان بخت وہی ہے جو اُس آنے والے دن آزمائش میں پورا اُترے لکل امرئ منھم یومئذ شان یغنیہ۔ اگر وہاں روح و ریحان و جنت النعیم

عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ہے۔ نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے عشق ہی ہے۔ تمام کائنات ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قائم ہے تو اسی کے دم سے، دنیا میں جس قدر ظاہر ہے یہی ہے، جس قدر باطن ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمھاری نگاہ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمال حقیقت یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں ورنہ

یک چراغ است درین خانہ کہ از پرتو آن   ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

بلاشبہ یہ بھی لغزش تھی، لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرا دیتے! مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش دستی ہی رہنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں، لاکھوں ہوشیاریاں اس پر سے نچھاور ہوں گر طمع خواہد ز من سلطان دین، خاک بر فرق قناعت بعد ازین اصل یہ ہے کہ اس راہ کا سارا مدار و مدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بُعد ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جڑنے کے لئے سب سے کٹنا، اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں جو پہلے کھول لئے تھے۔

در قبولِ نظرِ عشق ہزاران شرط است   اول از عافیتِ رفتہ ندامت باشد

. . . .

"تو اب اصل کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسوا ئے اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لئے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی ہو کہ گِن گِن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے، نہ ناخن گرہ کشا کی منت پذیری، نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کا انتظار۔ ایک سوکھی لکڑی کو جلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں کیجئے جب کہیں آگ سے دھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لئے بجلی کی ایک ہی نظرِ شعلہ بار کافی ہوتی ہے۔

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ میکنی   از یک نگاہ کشت، بہ ابرو نگر دہ داد

. . . .

"ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے؟ کوئی درمیانی منزل ہو اگر قدم آگے بڑھنے سے رُک گئے تو وہی منزل بُت ہے اور رہرو اُس کا پرستار، تسبیح آلائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو....

"چناں چہ الحمدللہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ کوئی مقام نہ چھوڑا......

"اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں لیکن ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش یا شمع کی خاموشی اور سوزش....

"اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برا ہونا مشکل ہے

عریاں تنی خوش است، و دے زینت گرفت   داماں چاک چاک و گریباں دریدہ را

. . . .

اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ زاری کی ہو تو کی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی کا ایک ایک لمحہ ایسا گزر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر چپکی ہیں۔ ہزاروں شورشیں سینہ کے اندر چلی ہیں، آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی تو دل کے گوشہ ہی میں طوفان اٹھاتے رہے.....

"اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی کامیابی میں پوشیدہ تھی....

"وہی دنیا جس کے میکدہ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا گوشہ گوشہ، چپہ چپہ، ہوشیاری و بینش کا مرقع تھا بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھول لی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاکِ پامال نے اُڑ اُڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بار بار اترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضاء آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ سورج چراغ

۔ نہ یا نہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اُتار دیئے، سارے پردے چلنی ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں.....

• حالات ابتداء سے جیسے اور جتنے رہے، سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے۔ جن تک بندے کی رسائی میسر آئی، قطع نظر اس معاملۂ خاص کے عقائد، اعمال، عادات، خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ پس اپنی شکستگی و خستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی، نہ کسی خاندان کی، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی، جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے جتنی نعمتیں ملیں صرف اُسی مُرشدِ فیض و ہادی طریق سے ملیں....

• علم کا دروازہ اُسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اُسی نے بتلائی، معرفت کے صحیفے اُسی کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اُس کے دستِ کرم میں تھے شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا قرآن کے بھید اُسی نے بتلائے۔ سنت کے اسرار اُسی نے کھولے، نظر اُسی نے دی۔ دل اُس نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اُس سے حل نہ ہوئی۔ کون سا اُلجھاؤ تھا جو اُس کی سلجھی ہوئی نظر سے نہ سلجھ گیا؟ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اُس کے دارالشفا سے نہ مل سکی؟ .....

" ہاں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اُس رندی اور ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کو عین اکیس بائیس برس کی عمر میں دکہ جنون شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوٹا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑ آ گیا ہے تو یہ اُس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے کتنی ہی جھاڑیوں میں دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں، دلوں، اُمنگوں، اُمیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں سے جلانے پڑے، جب کہیں جا کر اس کوچہ میں دم لے سکے، جہاں آج اپنے آپ کو پا رہے ہیں......

یہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کا ایک کارنمایاں ہے کہ پابندئ مذہب اور تصوّف میں مطابقت کر دی۔ اور مذہبی غلو جو شرعی پابندیوں کے اظہار میں بطور ریا داخل ہو گیا تھا۔ اس کی اصلاح جوشِ ایمانی کی قدر و منزلت بڑھا کر کر دی، خدا کی نگاہ میں منفعل گنہگار کو، اُس محتاط متبع شریعت سے، جس کی طاعت رسمی و رواجی ہو لیکن دل سرد ہو، اکثر زیادہ بلند مرتبہ مرحمت ہوا ہے۔ لیکن تذکرہ محض آزادی کی حمایت نہیں تھا۔ اس کے برخلاف، مولانا آزاد پابندئ مذہب کی، اُن لوگوں کی پابندئ مذہب کی جنھوں نے حق اور کلمۃ الحق کی زمانہ ساز فقیہوں اور غیر محتاط صوفیوں اور بے دین حکمرانوں کے مقابلہ میں حمایت کی، اپنے مخصوص زورِ بیان سے تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کسی طرزِ خیال کے پیرو نہیں ہیں۔ وہ قرآن کی یا شریعت کی کوئی خاص تفسیر پیش نہیں کرتے ان کا خاص تعلق رحمت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا خاص تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صحیح پابندئ مذہب، رحمت سے راسخ العقیدگی ہے۔

• تذکرہ مولانا آزاد کے خاندان کے مختصر حال سے شروع ہوتا ہے۔ میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں۔ اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ اُن میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دُنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ اُن کے سامنے پیش کیا اور کبھی انھوں نے قبول کیا، کبھی رد کر دیا۔"

مولانا آزاد یہ تذکرہ، یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں کہ اُن کا یہ خیال نہیں ہے کہ کسی خاندان سے متعلق ہونا کوئی افتخار و مباہات کی بات ہے۔ اس کے بعد وہ شیخ جمال الدین (و۔ ۱۵۰۱) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اُن کے مادری اجداد میں سے تھے۔ اُس کے بعد وہ اُس زمانہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ جمال الدین تھے وہ اکبر کا عہد تھا۔ اکبر نے مرتبۂ خلافت و امامت کا ادعا کیا تھا۔ یہ زمانہ اختلاف ہی کا تھا۔ بلکہ اُس وقت شدید مذہبی فساد تھا۔ صوفی جو وحدت وجود کا عقیدہ رکھتے تھے، بھگت، جو لا فرقیت کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ صاحبانِ تہذیب، جو ہر چیز میں، ہر جگہ ذہنی غذا کے جویا تھے۔ سیاست پیشہ جو حکومت کی ضرورت سے اتحاد کے لئے کوشاں تھے، عورتیں، جو خاندانی زندگی میں تقریبات اور مراسم کے اضافہ سے تنوع پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ ان سب نے ایسی صورت حالات پیدا کر دی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ گویا انسان اخلاقی احکام کی پابندی کے بغیر رہ سکتا ہے۔

لیکن اس صورت حال میں بھی جو لوگ الہلال کا آلۂ کار بنے اور مذہبی وجوہ سے اُن علماء کے مقابلہ میں جو اُس زمانہ کے حالات کو قایم رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے - اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا۔ مولانا آزاد جس خاص فتم کا تذکرہ میں ذکر کرتے ہیں اُس میں مہدی کے بانی، زمانہ ساز علماء ہی تھے اور حامی حق سید محمد جون پوری تھے - سید محمد کے اوپر الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک عقیدہ ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت سے پہلے امام مہدی ظاہر ہوں گے مخالفت کرنے والے علماء نے سید محمد کی تعلیمات کی مخالفت . ور اُن کی اخلاقی اور مذہبی حیثیت کو دبانے میں اپنی تمام طاقت اور اثر صرف کر دیا۔ ظاہری مخالفت سید محمد کے مہدیت کے دعوی کی تھی۔ مولانا آزاد نہایت اہمیت سے بیان کرتے ہیں کہ اصل مقصدِ مخالفت سید محمد کے تجدیدی رجحان، دعوت کلمۃ الحق اور اسوۂ حسنہ حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی دعوت کو دبانا تھا۔

سید محمد کے اوپر الزام لگایا گیا کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو صریحاً کفر ہیں۔ اور اس سے مولانا آزاد کو یہ گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مستقل کیفیت وجدان پر فائز کیا ہے وہ کس حد تک اپنے بیانات کے ذمہ دار ہیں اور جس آزادیٔ بیان کے وہ مستحق ہیں وہ اُن کو ملنی چاہیئے - یہاں مولانا آزاد کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ والے لوگ اُس فضل سے پہچانے جاتے ہیں جو اُن پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے - اُس زمانہ کے مومنوں پر واجب ہے کہ اُن کے بیانات کو فقہی تنقیحات کا موضوع نہ بنائیں۔ بلکہ اُن کے بیانات میں جو کچھ حق ہو اُس کو اخذ کریں۔

مولانا آزاد کے نزدیک پابندیٔ مذہب پر فخر و مباہات اور اعمال سے غفلت قابل نفرت ہے۔ وہ اپنی تمام انشاپردازی کی قوت کو ایسے لوگوں کی بزرگی اور علوِ مرتبت بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں، جیسے شیخ علائی (و - ۱۵۵۰) شیخ نیازی، شیخ جمال الدین جنھوں نے کلمہ حق کی حمایت کی اور زمانہ ساز علماء مثل مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کی فاسقانہ اور تباہ کن حکمت عملی کی مخالفت کی۔

یہ دونوں علماء اُس طبقہ کے تھے - جس نے شریعت اسلامی میں، غیر واقعی تاویلات، غلط اجتہاد اور پاکیزہ اخلاق کے اصولوں سے عدم توجہی کو داخل کر دیا۔ مولانا آزاد اُن ہی حالات کا اعادہ اور تکرار، اکبر کے زمانہ میں دیکھتے ہیں۔ جو اس سے پہلے زمانوں میں اللہ والوں کو برداشت کرنا پڑے۔ جیسے امام حسین علیہ السلام، شیخ سعید ابن مصعب، امام مالک امام حنبل، امام ابن تیمیہ، وہ اپنے زمانہ میں شک، تذبذب اور بے دینی کی لعنت دیکھتے ہیں اور اُس کو ایسے شغف، سرجوشی اور کمال ذوق سے بیان کرتے ہیں کہ اُس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلائے حق کرنے والے ہندوستان میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن شخصیتوں کے علاوہ جن کا ذکر آیا ہے - شیخ سلامی (و - ۱۵۰۴)، شیخ داؤد (و - ۱۵۷۴)، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس سے پہلے حمایت حق کی۔

ایقان کے لئے دولت کی، تمام زندگی عمل صالح کے لئے وقف کرنے کی بدکاروں سے مقابلہ کرنے کے عزم کی اور اللہ کے فکر و غم میں شرکت کرنے کی ضرورت ہے - تذکرہ میں خاص طور پر اسلامی روایات کا ذکر ہے۔ اور یہ مولانا آزاد کے ارتقائے خیال کا نسبتاً ایک غیر پختہ منزل ہے - جس میں اُن کی بعد کی تصنیف ترجمان القرآن کی عالم گیریت کم ظاہر ہوتی ہے۔ ان دونوں تصانیف کے درمیان یقیناً پندرہ بیس برس کا تفاوت ہے۔ یہ دونوں قطعاً مختلف حالات میں لکھی گئی ہیں یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ جس کیفیت مزاج میں تذکرہ لکھا گیا۔ اُس میں تبدیلی واقع ہو گئی ہو۔ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات نے اس بات کو اُن پر واضح کیا کہ تصورِ حق و صداقت میں نیک کام کرنے کے فراخ تر میدان کا شامل ہونا، روحانی ضرورت ہے۔ اور اس تخیل نے اُن کا تصورِ حق و صداقت اور زیادہ وسیع کر دیا ہو۔

لیکن واقعات ایک دوسرے رُخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مولانا آزاد میں تبدیلی نہیں ہوئی وہ مسلم رہنما سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر نہیں بنے۔ تذکرہ سے اُس کیفیت مزاج کی تصویر نظر آ جاتی ہے۔ جس کیفیت میں وہ قومی تحریک سے نہایت موثر ہو گئے تھے کہ حق کی حمایت کریں اور اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ، ایسے لوگوں کو شامل کریں جو اُن کی روحانی زبان سمجھتے ہوں اور عظیم اخلاقی روایات کی حمایت کرنے کے لئے طلب کئے جا سکیں اُن کا تمام استدلال اپنے اندر وہ وعدہ مضمر رکھتا ہے۔ جو ترجمان القرآن کے اندر پورا ہوا، کلمۃ الحق کی تشریح اور تفسیر کا وعدہ، تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کے متمم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں تذکرہ نے تبلیغ عقیدہ کو، اپنے خطیبانہ طرز بیان میں پیش کر کے، عالم گیر مقبولیت اور رفعت حاصل کی ہے۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

مولانا آزاد - 'غبارِ خاطر' کے آئینے میں!

یوں تو پچھلی صدی سے اب تک اُردو میں خطوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے لیکن پچھلی صدی میں غالب کے خطوط (اُردوئے معلی اور عودِ ہندی) اور موجودہ صدی میں مولانا آزاد کے مجموعۂ خطوط (غبارِ خاطر) کو طرۂ امتیاز حاصل ہے دونوں کا اندازِ نگارش جدا لیکن دونوں نے بات میں بات پیدا کی ہے۔ مولانا کی زندگی غالب سے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھی اس لئے اُن کے خطوط میں جو نکات اور مسائل پائے جاتے ہیں وہ غالب کے ہاں نہیں پھر بھی غبارِ خاطر میں مولانا نے سیاسیات کے تذکرہ سے گریز کیا ہے اگر کہیں اشارے ہیں تو اس انداز میں کہ مکتوب الیہ سمجھ جائے۔ غالب کے خطوط مختلف دوستوں، محسنوں، شاعروں اور شاگردوں کے نام ہیں مولانا کے خطوط صرف ایک ہی ہستی کے نام یعنی صرف نواب صدر یار جنگ مکتوب الیہ ہیں۔ غالب نے گھر بیٹھے خطوط لکھے، مولانا کے بیشتر خطوط جن پر غبارِ خاطر مشتمل ہے، قلعہ احمد نگر کی نظربندی کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں یہ بھی ایک بڑا فرق ہے۔ یہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچتے نہیں تھے لیکن مولانا کے دل کی تسلی ہو جاتی تھی گویا ان کی نوعیت میگھ دوت سے ملتی ہے جہاں ایک گندھرپ بادلوں سے مخاطب ہو کر اپنے دل کے جذبات بیان کر دیتا ہے۔ مجھے خود بھی سزا یافتہ اور نظربند قیدی کی حیثیت سے جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ جیل کی زندگی جسے عام طور پر بے چارگی کی زندگی سمجھا جاتا ہے۔ بڑی شدت کی زندگی ہوتی ہے یعنی سیاسی قیدیوں اور نظربندوں کی طبیعت کے پردے جو ہر جیل میں کھلتے ہیں مولانا اس نظربندی کی حالت میں اپنے اصل روپ میں نظر آتے ہیں۔ ورنہ وہ عام نظروں میں یا مولوی ہیں یا سیاسی نیتا یا پھر اس کے بعد وزیرِ تعلیم اور ان میں سے ہر حیثیت میں اُن سے کہا جا سکتا ہے کہ

ع - نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اِن خطوں میں مولانا کی انفرادیت نظر آتی ہے وہ آزاد جو زمانے کو للکارتا ہے کہ مجھے رُلا کر تو دیکھ دل دردمند رکھتا ہے اور روتا نہیں لذتِ غم کے مزے لیتا ہے اور چہرے پر شکن نہیں آنے دیتا (تو یہ تو میں صیغۂ واحد غائب میں لکھنے لگا) ہاں تو مولانا فرماتے ہیں:-

"جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں اُسے قیدخانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟"

اسی طرح سونے جاگنے کے معاملے میں لکھتے ہیں:-

"زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریکِ حال ہو..... زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے اُلٹی ہی چال میرے حصہ میں آئی، دنیا کے لئے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ خوابِ شیریں کے مزے لیں میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت یاب

ہوتا ہوں۔

خلق را بیدار باید بود تا آبِ چشم من
دوش عجب کاندم کرمی گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا میں نے دنیا کو ایسی بڑاتوں کا شروع سے موقع ہی نہیں دیا وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔"

اس آخری جملہ سے گیتا کے دوسرے ادھیائے کا یہ شلوک ذہن میں آجاتا ہے جو مہاتما گاندھی کے وظیفۂ شام و سحر میں داخل تھا

یا نشا سروبھوتانام تسیام جاگرتی سنیمی
یسیام جاگرتی بھوتانی سانشا پشیتو منیہ

(جو تمام مخلوق کے لئے رات ہوتی ہے اس میں یوگی جاگتا ہے اور جس میں تمام مخلوق جاگتی ہے اُسے رات دکھائی دیتی ہے) یعنی اہل منتہیاں روزگار کی سحر و شام عوام سے الگ بلکہ متضاد ہوتی ہے۔

اسی انفرادیت نے مولانا میں بے پناہ قوتِ برداشت پیدا کر دی تھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مرزا غالب نے رنج گراں نشیں کی حکایتیں لکھی تھیں صبر گریز پا کی شکایتیں کی تھیں۔

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں کہئے
کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہئے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔"

سب سے سخت امتحان کا وقت مارچ۔ اپریل ۱۹۴۳ء کا تھا مولانا کی گرفتاری کے وقت بھی اُن کی اہلیہ بیمار تھیں مارچ میں حالت زیادہ خراب ہو گئی اور اپریل میں رحلت فرما گئیں اس درمیانی وقفہ میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور مولانا کے جیل کے ساتھیوں نے چاہا کہ کوئی سبیل نکالی جائے کہ مولانا رفیقۂ حیات کا آخری دیدار کر لیں مگر مولانا کی طبعِ غیور نے اسے گوارا نہ کیا مولانا لکھتے ہیں:۔

" جس دن تار ملا اُس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا۔ درمیان کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور اُن سے اس بارے میں گفتگو کی وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے میں نے اُن سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایماء سے کہی تھی۔" غالب کا یہ شعر غالب سے زیادہ مولانا کے کیرکٹر پر صادق آتا تھا۔

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

مولانا کے چند جملوں سے اُن کی اس انفرادیت کا اندازہ کیجئے۔

" لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے

در کوئے ما شکستہ دلی مے خرند و بس
بازار خود فروشی ازاں سوئے دیگر است

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

بار فیضان ز خود رفتہ مفروست نہ داد
سیر صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہو گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔"

جہاں تک انانیتی ادبیات کا تعلق ہے مولانا نے ۹، جنوری ۱۹۴۳ء کے

خط میں اس پر بحث کی۔ ذرا سے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تجارتی ادب کتنا حقیر ہے یہی نہیں بلکہ خطیبانہ ادب اور عوامی ادب کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے اس خط میں دنیا کی چند عظیم ہستیوں کے اندازِ فکر کا جو جائزہ لیا گیا ہے وہ دنیا کے ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مذہبی رواداری

مولانا مسلمان تھے خاندانی عالم تھے، ترجمان قرآن فقہ و احادیث کے تمام رموز سے باخبر لیکن بایں ہمہ وہ کٹر ملا نہیں تھے۔ چناں چہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں الٰہیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دنیا میں وحدت الوجود کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے غالباً یونان و اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید نے جسے غلطی سے عرب نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخصات سے منزہ کرکے ایک کامل مطلق تصور قائم کر دیتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات و مظاہر کے اعتبار سے نہ کہ ذاتِ مطلق کی ہستی کے اعتبار سے، اس عقیدہ کا روشناس اس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے کہ ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو وہ ذاتِ مطلق مطلق نہیں رہتی، متشخص اور غبار کے حدود سے آلودہ ہو جاتی ہے بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست

اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اپنشدوں نے نفی صفات کی راہ اختیار کی اور تنزیہہ کی 'نیتی نیتی' کو بہت دور تک لے گئے لیکن پھر دیکھئے کہ اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذاتِ مطلق) کو ایشور (ذاتِ متصف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے بلکہ پتھر کی مورتیں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے۔

کرے کیا کعبہ میں جو سر بہ بتخانہ سے آگاہ ہے

یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے"

مولانا کی تفسیر قرآن میں اُن کی مذہبی رواداری اپنے بھرپور روپ میں نظر آتی ہے اس اعتبار سے ترجمان القرآن کا مقابلہ لوک مانیہ تلک کے گیتا رہسیہ سے کیا جا سکتا ہے ان دونوں کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے والا حقیقی معنوں میں مذہبی آدمی ہو سکتا ہے فرقہ پرست کبھی نہیں ہو سکتا اسی خط میں مولانا نے آگے چل کر لکھا ہے۔ "ہندوستان کے اپنشدوں نے ذاتِ مطلق کو ذات متصف میں اُتارتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے مسلمان صوفیوں نے اُس کی تعبیر احدیت اور واحدیت کے مراتب میں دیکھی"

اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ مولانا ایک کٹر ملا کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ مولانا احمد نگر کے قلعہ میں جس کمرے میں نظر بند کئے گئے تھے اس میں چڑیاں بہت تھیں مولانا نے اُن میں سے چند کے نام بھی رکھ دئے تھے جس کا نام ملا رکھا تھا اس کے متعلق لکھا کہ

" ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے جو بھی سامنے آ جائے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہیں رہے گا کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی مگر پیچھے ہی مقابلہ میں چت ہو گئے جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سر و سینہ کو جنبش دیتے ہوا اور دہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً موجود ہوتا ہے اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں چوں چاں چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظ بلک جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے.... قطعہ اگر اس کا نام ملا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا" اور جس چڑے کا نام صوفی رکھا ہے اس کے صفات یوں بیان کرتے ہیں

" ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے تعرف لاشیا بہ اضدادہم، اسے جب دیکھئے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی نا تمام چوں کی آواز نکال دی

اور اس ناتمام پیچوں کا بھی؛ غالباً حلقہ دہن کا نہیں ہوتا بلکہ ایک
ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکا کے اپنی حالت میں
گم پڑا رہتا ہو اور کبھی کبھی سر اٹھا کے "ہا" کر دیتا ہو۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

دوسرے چشمے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں گویا اس کی کم سخنی
سے عاجز آ گئے ہیں۔ پھر اس کی زبان کھلتی نہیں البتہ نگاہوں
پر کان لگائیے تو ان کی صدائے خاموش سنی جا سکتی ہے۔

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ ست
تو سخن فہم نۂ ورنہ خموشی سخن ست

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا۔"

چاء سگریٹ

کھانے پینے کے معاملہ میں گاندھی جی اور مولانا آزاد کے نظریوں میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے گاندھی جی چاء کو زہر اور مل کی بنی ہوئی چینی کو سفید زہر کہا کرتے تھے۔ لیکن مولانا نے چاء کی تعریف میں بائیس صفحے لکھ دیئے گاندھی جی نے شکر کی جگہ گڑ استعمال کرنے کو کہا ہے۔ لیکن مولانا کو اس بات پر تاسف آمیز حیرت ہے کہ جواہر لال ایسا شخص گڑ کھانا پسند کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں اس لئے
گڑ کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں میں نے یہاں ہزار کوشش
کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لئے اس درجہ نمایاں
ہے انھیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کر
رہ گیا۔"

گاندھی جی سفید شکر کے اس لئے خلاف ہیں کہ اس کا غذائی جوہر نکل جاتا ہے لیکن مولانا یہ چاہتے ہیں کہ چاء کے لئے جو شکر ہو وہ بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو یعنی وہ معمولی چینی سے بھی مطمئن نہیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کئے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے، صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیئے جاتے ہیں، گاندھی جی اور مولانا آزاد کا یہ اختلاف محض سطحی نہیں بات یہ ہے کہ گاندھی جی کا نظریۂ حیات افادی ہے اور مولانا کا جمالیاتی، گاندھی جی سگریٹ کے بھی سخت خلاف ہیں۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں:

"میں نے چاء کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے
ترکیب دے کر ایک کیف مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے
میں چاء کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی
سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیب خاص کا نقش عمل یوں جماتا ہوں
کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چاء کا ایک گھونٹ لوں گا اور
متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔"

اس معاملہ میں جب گاندھی جی اور مولانا کے نظریوں یا عمل کو سامنے رکھئے تو یہ نظر آتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی روش دونوں کے بیچ بیچ ہے۔ مولانا نے خود اس چاء اور سگریٹ کے بارے میں فرمایا ہے کہ آپ کہیں گے چاء کی عادت بجائے خود ایک علت تھی اس پر مزید علت بڑھائے تا فرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے۔ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا علتوں پر علتیں بڑھانا گویا حکایت بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خودساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں لیکن کیا کہوں جب کبھی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کو کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں۔"

اس پر بے ساختہ برنارڈ شا کی وہ بات یاد آ جاتی ہے جو انھوں نے گاندھی جی کی شہادت پر کہی تھی کہ اس دنیا میں ضرورت سے زیادہ نیک بھی خطرناک ہے۔

قوتِ حافظہ

مولانا نے جس طرح ان خطوں میں عربی، فارسی، اُردو کے اشعار و فقروں کو جا بجا نقل کیا ہے اس سے اُن کے حافظہ کی داد دینی پڑتی ہے ظاہر ہے کہ جیل میں تو اُن کے پاس وہ کتابیں تھیں نہیں جن کے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ لیکن مولانا نے اپنی یادداشت کے بل پر حوالے دیئے ہیں۔ دیکھا لوک مانیہ تلک نے جب گیتا رہسیہ جیل میں لکھی تھی تو انھوں نے حوالے دیئے مگر حوالوں کی جگہ اس لئے چھوڑ دی تھی کہ جیل سے باہر پہنچ

... پیدا کی ہو دیہ قوت حافظ مولانا کی یک سوئی طبع کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ ... نوں میں بھی پُرسکون رہ سکتے تھے اور سیاسی ہنگاموں میں بھی اپنی ادبی ... مشاغل قائم رکھ سکتے تھے یہ بڑی بات ہے جو اس عالم آب و گل میں خاص خاص ... لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اشعار اور فقروں کا برمحل حوالہ لا جواب ہے۔ اگر ... کوئی جواب ملتا ہے تو وکٹورین دور کے آئیرادیب لارڈ اوبری کے یہاں جو پیو سا آف لائف اور پلیژرس آف لائف کے مصنف تھے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

"بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی گویا کسی گوشے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی جیسے اسی وقت کسی نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے واقعات کے نقوش کبھی اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا یا درمیانی سطروں میں نیز صفحہ کا رُخ کہ دہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔"

تحقیق

محققوں کی دُنیا میں بھی مولانا صفِ اوّل میں ہیں۔ قلعہ احمد نگر پہنچے تو چند سطروں میں وہاں کی ساری تاریخ بیان کر دی۔ چاء کا بیان کرنے پر آئے تو اس کی تاریخ قسمیں پینے کے طریقے سب اس انداز میں بیان کئے کہ چاء نہ پینے والا بھی پورا لطف لے سکتا ہے۔ ۱۶ اکتوبر کے خط میں الٰہیات کا ذکر کرتے ہیں تو قدیم عقیدوں سے لے کر جدید تحقیقات تک کے حوالے دل کش اور ذہن کش انداز میں پائے جاتے ہیں۔ ویدوں کے زمانہ سے لے کر انسٹائین کے تصورات تک ان کی طبع رسا کی جولانی نظر آتی ہے تمام متمدن ملکوں اور قوموں کے تدبروں کی کہانی چند صفحوں میں بیان کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہی کیفیت ۵ دسمبر کے خط میں ہے جس میں پانچویں صلیبی حملہ کی سرگزشت اور اس کے سیاسی اور مذہبی نتیجوں کا تذکرہ ہے۔

صاحب ...

... کے عنوان سے جو خط غبارِ خاطر میں درج ہے ... اس سے مولانا کی قوتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی دل کشی، واقعات کا مشاہدہ، ذاتی تجربہ، طبیعتوں کا جائزہ غرضیکہ ان داستانوں میں ایک صاحبِ دل کا دل اور ایک صاحبِ نظر کی نظر دکھائی دیتی ہے۔ ایک فلسفی کس طرح قدرتی مناظر کو دیکھتا، اور اُن کا لطف لیتا اور رنگینی کے ساتھ انھیں بیان کرتا ہے اس کا نمونہ شاید ہی اس سے بہتر کہیں مل سکے۔

چند نشتر

ان خطوں میں چند در چند نشتر ہیں بخوفِ طوالت صرف دو پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصّے میں تمنّاؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے انھوں نے پھول چُن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دئے۔

۲۔ یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے مزگی ہے۔ تبدیلی اگر چہ سکون سے اضطراب کی ہو مگر پھر تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذت ہوتی۔ عربی میں کہتے ہیں حسد عذوا معما لسکر ... جن جسموں کا ذائقہ بدلتے رہو مگر یہاں زندگی کا مزہ بھی انھیں کو مل سکتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اُس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں۔

ایک سوال اور اُس کا جواب

مولانا کی انفرادیت تنہائی پسندی علمیت اور فلسفیانہ رُخ سے زندگی کو دیکھنے کی نظر کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنے بڑے لیڈر کیسے بن گئے اُس کا جواب ان کی مندرجہ ذیل عبارت کے آخر جملہ میں ہے:-

" زمانے کے بہت سے حیلے میرے لئے بیکار ہوگئے، لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور زیادہ منت گذار ہونے لگتا ہے کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی، اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا، تھا سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔"

اسی وجہ سے مولانا میں خلوت در انجمن اور انجمن در خلوت کی کیفیت رہی بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے ایسا جامع کمالات شخص جس میں قدیم و جدید کی ایسی آمیزش ہو اور جس میں ماضی اور مستقبل کی اتنی صلاحتیں ہوں اب پیدا ہونا مشکل ہے۔

تھے۔ نہ جانے کیوں مولانا کو خیال ہوا کہ ڈائمنڈ ہاربر چلا جائے اور سمندر کی سیر کی جائے۔ اسی وقت گاڑی منگائی گئی۔ موٹر میں پٹرول بھرا گیا اور مولانا کے ساتھ میں، قاضی نورالامام اور ڈپٹی نجم الدین بیٹھ گئے۔ موٹر چل پڑی۔ ڈائمنڈ ہاربر کلکتے سے ۳۰-۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ موٹر اڑی چلی جا رہی تھی، دفعتاً رُک گئی۔ کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے پوری کوشش کی مگر بے سود۔ آخر اعلان کر دیا موٹر چل نہیں سکتی۔ ہم لوگ کلکتے سے بہت دور ایک اُجاڑ جگہ پر تھے۔ ۱۰-۱۵ منٹ چل کر ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچ سکتے تھے۔ آخر جانا ہی پڑا۔ مگر یہ اسٹیشن چھوٹی لائن کا تھا بڑی کوفت ہوئی لیکن کرتے تو کیا کرتے۔ مجبوری کے ایسے موقعوں پر مولانا اپنے آپ کو سنبھال کے ایسے بن جاتے تھے جیسے کوئی پریشانی نہیں ہے اور لطائف و ظرائف کے نہ ختم ہونے والے خزانے کھل جاتے تھے

مگر ہم ایک کور دہ مقام میں تھے اور چھوٹی ریلوے کے اسٹیشن سے سابقہ تھا۔ طے پایا تھا کہ سمندر پر پہنچ کر کھانے پینے کی فکر کریں گے۔ مگر اب ہم سمندر سے دور یہاں تھے۔

یوں تو بھوک نہیں لگتی لیکن معلوم ہو جائے کہ کھانے کا سامان ممکن نہیں تو بھوک ٹوٹ پڑتی ہے۔ اب ہم بہت بھوکے تھے۔ ڈپٹی نجم الدین کی عمر ۸۰-۸۵ سے کیا کم ہوگی۔ سب سے زیادہ بھوک میں مبتلا یہی تھے۔ خود مولانا بھی بھوکے تھے مگر ظاہر کیسے کرتے۔ اسٹیشن پر کسی قسم کا کوئی کھانا نہ تھا۔ اب ہم کریں تو کیا کریں۔ بڑی مایوسی سے دو چار تھے۔ دفعتاً ایک لڑکا نمودار ہوا سر پر ٹوکری اُٹھائے۔ ہم سب اس پر ٹوٹ ہی تو پڑے۔ صرف مولانا اپنی جگہ پر کھڑے مسکراتے رہے۔ ٹوکری اُتروائی تو بالکل کچے امرود نکلے۔ ڈپٹی صاحب خوشی سے چیخ اُٹھے۔ پوری ٹوکری خرید لی گئی۔ میں نے عرض کیا لیکن یہ کچے امرود آپ کھائیں گے کیسے دانت کہاں ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔ چبائے بغیر ہی نگلتے چلے جائیں گے۔ مولانا اس منظر سے پورا لطف اُٹھا رہے تھے۔ مگر آخر بھوکے تو تھے ہی امرود ان پر وہ وہ ہاتھ مارے کہ آج تک یاد ہے۔ امرود چٹ کرنے سے کچھ تسلی ہو گئی۔ مگر ریل آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گرمی سخت تھی اور ہم پسینے سے شرابور مگر مولانا پر اس آفت کا ذرا اثر نہ تھا۔ چٹکیوں پر چٹکیاں کرتے چلے جاتے تھے اور جب سنجیدہ ہوتے تو مناسب موقع کوئی تاریخی واقعہ سنانے لگتے یا پھر کلام اللہ کی کسی آیت پر موتی لٹانے لگتے۔

یہ واقعہ ہے کہ مصیبت کے اس زمانے میں مولانا کی زندہ دلی اور وقار کو دیکھ کر میں عش عش کیا کرتا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس شخص میں کیسی قوت برداشت ہے، خدا پر کیسا بے حد بھروسہ ہے۔ آدمی مصیبت میں ہی پہچانا جاتا ہے اور مولانا ہر مصیبت میں خواہ کتنی ہی بڑی رہی ہو، سرفرازی رہے۔

لیکن ابھی ایک مضحکہ خیز واقعہ اس واقعے کی تکمیل کے لئے باقی ہے۔ اُکتا ڈالنے والے کئی گھنٹوں کے بعد خدا خدا کر کے ریل گاڑی آئی اور ہم سوار ہو گئے۔ چیونٹی کی چال چل کر ریل نے ہمیں کلکتے کے مضافات خضرپور میں اُتار دیا۔ ہر چند تلاش کرتے رہے کوئی ٹیکسی نہ ملی۔ اب شام ہو رہی تھی مجبوراً ٹرام گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ مولانا ٹرام کی بنچ کے بالکل کنارے اس طرح بیٹھے تھے گویا جست لگانے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ بیٹھے نہیں بس یوں سمجھئے کہ بنچ پر ٹکے ہوئے تھے اور گھبرا کر ہر طرف دیکھتے جاتے تھے کہ کسی کی نگاہیں تو نہیں پڑ رہی ہیں۔ بالکل گم سم تھے۔ ایک اسٹینڈ آیا اور ٹرام ٹھہر گئی۔ ایک دو مسافر داخل ہوئے ٹرام ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی کہ ایک مسافر نے زور سے نعرہ مارا "السلام علیکم مولانا!" ساتھ ہی ہاتھ پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔ اب مولانا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے تپ دق کا کوئی بیمار آخری مرحلے میں ہو۔ چہرہ بالکل سفید، ہونٹ بھنچے ہوئے، آنکھیں نیچی، کسی قدر تلخ لہجے میں اس آفت ناگہانی معتقد سے فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ میرے بھائی۔" پھر مجھے بڑی بے بسی کی نظروں سے دیکھا۔ میں تو مزاج آشنا تھا ہی، اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹرام کی رسی زور سے کھینچ کر پوری طاقت سے گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ ایک آدھ منٹ کے اندر ٹرام رک گئی۔ ہم سب اُتر پڑے اور مولانا نے فرمایا۔ "سخت کوفت اُٹھانا پڑی، ہم ٹیکسی کا انتظار کریں گے۔" ٹیکسی جلد مل گئی اور ہم گھر پہنچ گئے۔ مگر اس داستان کا چرچا مولانا نے مہینوں اپنی خاص وضع سے جاری رکھا۔ اتنا ہنسایا اتنا ہنسایا کہ اب کیونکر بیان کروں۔



مولانا آزاد مہاتما گاندھی کی چتا پر

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء





صدر کانگریس مولانا آزاد شملہ کے سیسل ہوٹل میں (۲۴ جون ۱۹۴۵ء بوقت شب)

(بشکریہ محمد اجمل خاں صاحب)

مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن

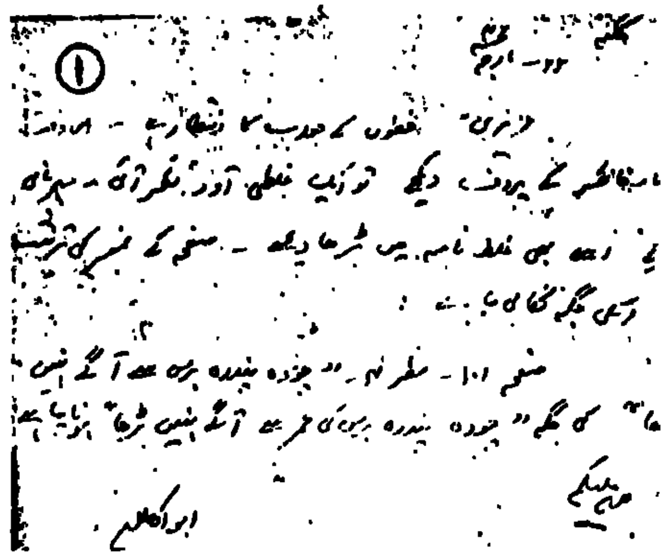
(اگست ۱۹۴۷ء)

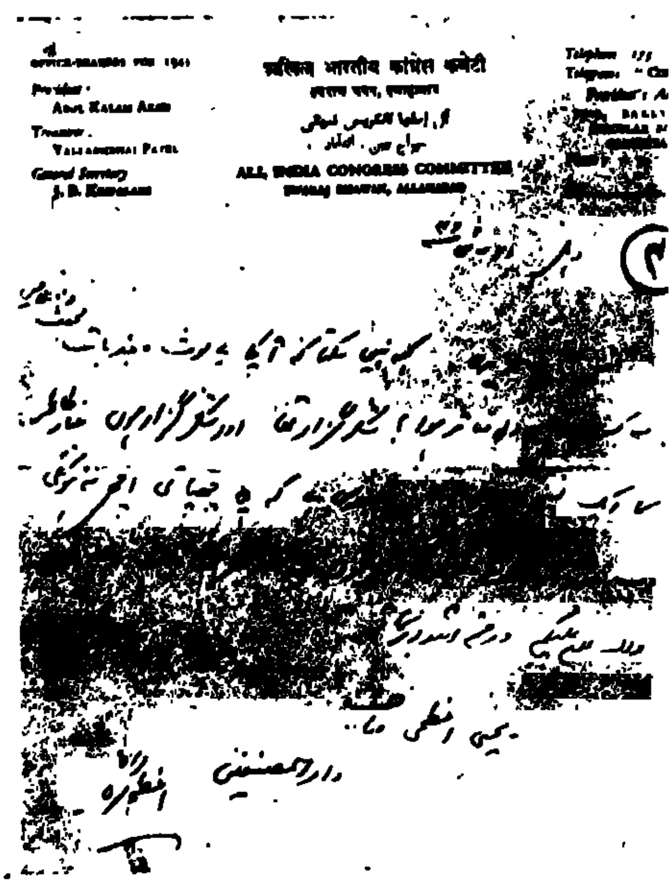


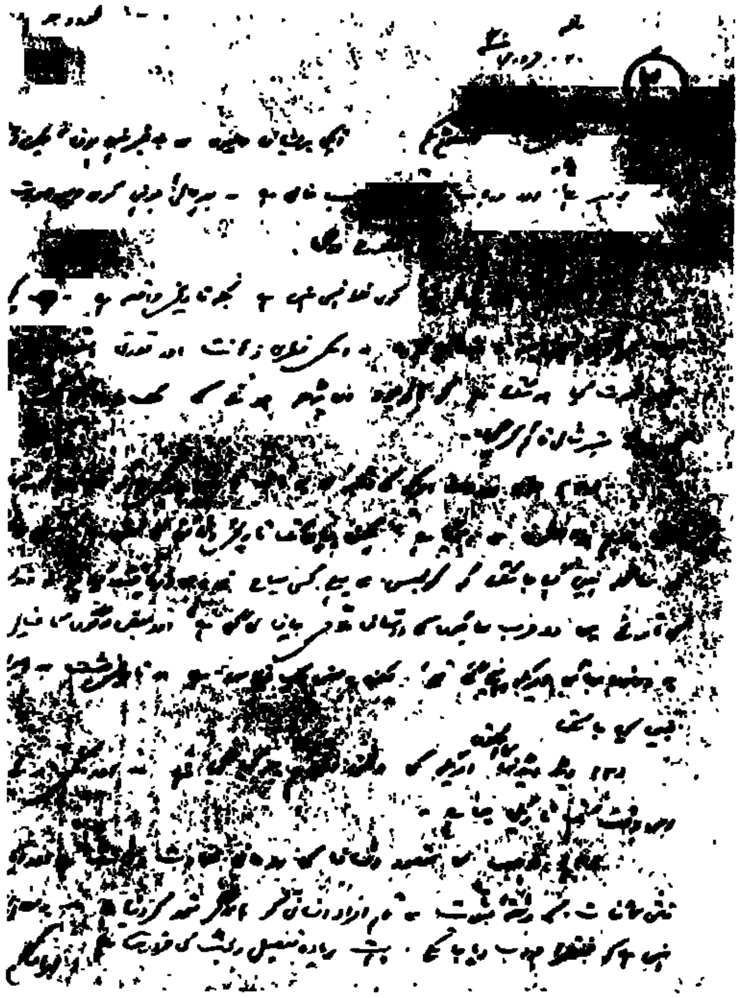
مولانا آزاد جے پور کانگریس میں

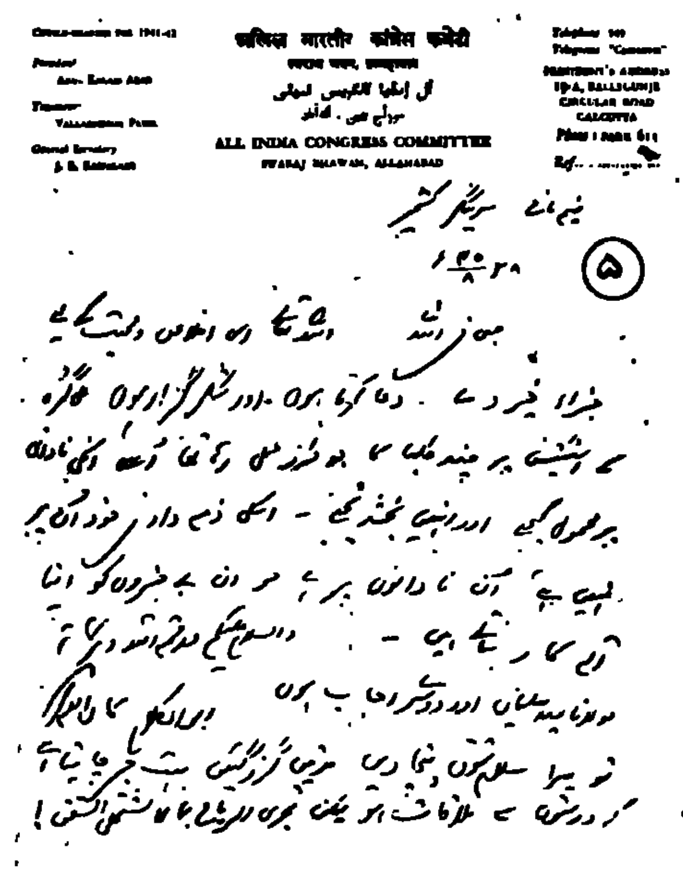
(دسمبر ۱۹۴۸ء)

مولانا آزاد کے چند خطوط



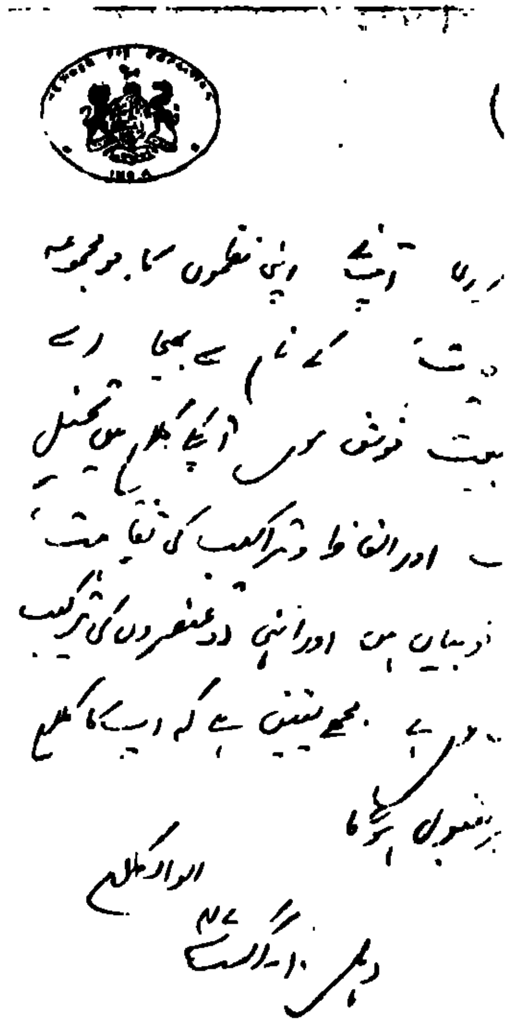






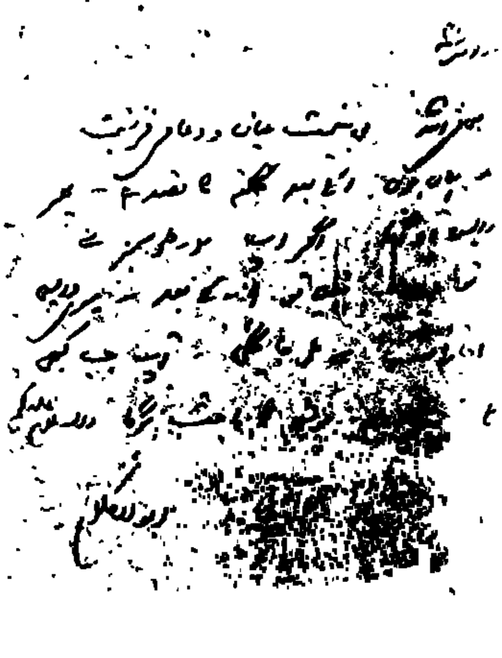


مولانا آزاد ۱۹۴۳ء میں



ابوالکلام

دہلی ۱۰ اگست ۴۷



OFFICE-BEARERS FOR 1941

President: Abul Kalam Azad

Treasurer: Vallabhbhai Patel

General Secretary: J. B. Kripalani

अखिल भारतीय कांग्रेस कमेटी

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE

Swaraj Bhawan

۱۔ غلام رسول مہر کے نام

۲۔ ایم اے ذکریا بھاگلپوری کے نام (بشکریہ محمود واجد)

۳۔۴۔۵۔۶ یحییٰ اعظمی کے نام





اوپر دائیں : مولانا آزاد مہاتما گاندھی سے کسی مسئلے پر گفتگو
فرما رہے ہیں

اوپر بائیں : مولانا ابوالکلام آزاد بہ حیثیت صدر،
آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تاریخی اجلاس منعقد
۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کے ساتھ۔
"ہندوستان چھوڑ دو" کی قرارداد منظور ہوا

دائیں : مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو
وزارت تعلیم کے افسران کے ساتھ

نیچے : مولانا آزاد پارلیمنٹ ہاؤس کے سنٹرل ہال میں
انڈین نیشنل کمیشن برائے یونیسکو کے افتتاحی
جلسے میں صدارتی تقریر فرما رہے ہیں۔



ر ہمایوں کبیر — پنڈت نہرو — ڈاکٹر کاٹجو — مولانا آزاد — مسٹر ایم - این - مسعود



مولانا آزاد کا ایک خط

قلعہ احمد نگر

۱۱-اپریل ۴۳ء

آنچہ دل از تنگیِ آں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہریِ گردوں بہ آں ہم ساختیم

صدیقِ مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسبِ معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا، کمرے میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اُٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کر دوں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں، یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اس طرح گزریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بہ پائے ہمسر تاں
چگونہ حرف زنم دل کجا دماغ کجا

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا

جائے گا[1]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے تھے، اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لئے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳۔ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا، اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳۔ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقع پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۱۱ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا۔ اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی، اس لئے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالات دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لئے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳۔ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم یہ ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیئے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لئے ابتدا سے یہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جاسکے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلیگراف آفس ہی کے ذریعے آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جاسکتی۔ اگر

---

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لئے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

تا بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہئے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا، وہاں سے احتساب کے بعد سے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لئے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لئے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۱۳ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آ چکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں، پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میں ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی لیکن بعد میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے۔

اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا گویا اب دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام نمابرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے ما نع کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس نے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پر بےحالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دے کیں صورت بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹۔ اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فاتت ما تحسن دینٍ، قد دقع!

۴ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی۔ اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا اس کے لئے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ لیکن جونہی انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم ز راہ و لے آہ چارہ نیست

زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لامنی عند القبور علی البکا — رفیقی لتذراف الدموع السوافک

فقال اتبکی کل قبرٍ رأیتہ — لقبرٍ ثوی بین اللوی فالدکادک"

فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا — فدعنی، فھذا کلہ قبر مالک"

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر

اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

(غبارِ خاطر سے)

فاتحۃ السنۃ الثالثۃ

"جو ربّ الارباب انسان کی غذا جسمانی کا یہ سب کچھ سامان رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس کی روحانی غذا کا انتظام نہ کرے۔ یہ روحانی غذا کیا ہے۔ یہ ہدایت و سعادتِ انسانی کی دعوتِ الٰہیہ ہے جس کے لئے فی الحقیقت روحِ انسانی بھوکی پیاسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسم جسمانی مدتوں کی بھوک اور پیاس کے بعد بےقرار و مضطرب ہو کر غذا کو پکارتا ہے اسی طرح ضلالت کی شدت اور ہدایت کا فقدان بھی روحِ انسانی کو ایک معنوی جوع و عطش میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے لئے اپنی غذا کو دیوانہ وار پکارنے لگتی ہے۔ پس وقت آتا ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق، اس فاطر الارض والسماوات، اس مدبر الامر والاشیاء اور اس مسبب الاسباب حقیقی کی ربوبیت ظاہر ہوتی ہے جس نے انسان کی حیاتِ جسمانی کے لئے تمام دنیا کو طرح طرح کے اغذیہ و ثمرات کی بخشش سے ایک خوانِ کرم بنا دیا ہے۔ اس کا دستِ محبت غذائے روحانی کا بیج بوتا ہے اور اپنی نشو و نما سے اسے یکایک سربلند و بالا قامت بنا دیتا ہے۔ پھر اس کی سعادت و ہدایت کی نعمتوں سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بھر جاتے ہیں اور اس بخشش کی دعوت سے ارضِ الٰہی گونج اٹھتی ہے۔"

(الہلال ۱۳ جنوری ۱۹۱۳ء)

یحییٰ اعظمی

آہ! مولانا ابوالکلام آزادؒ

جس کی زباں کا حرف حرف، لمعۂ جاں نوائے راز دفترِ علم و آگہی نوکِ قلم سے جس کے باز
شانِ حیات جس کی تھی اوجِ شرف سے سرفراز عرشِ کمال و فضل تھا جس کا مقامِ امتیاز
نشأۃ تازہ جس نے دی قوم کو وہ ابوالکلام
بامِ حریمِ قدس تھا جس کی حیات کا مقام

پیکرِ عزّت و شرف، مظہرِ عظمت و جلال پیشِ نظر منظرِ فروز ایک مرقعِ جمال
خازنِ فضل و علم و فن، خاتمِ دانش و کمال قاسمِ بادۂ کہن، ساقیِ دورِ اہلال
اُٹھ گیا وہ تو بے فروغ مطلعِ یقیں ہے آج
پیرِ مغاں کے ہجر میں بزمِ مغاں حزیں ہے آج

حیف خموش ہوگیا باغِ ادب کا عندلیب اٹھ گیا ہند کا امام سوگیا قوم کا خطیب
اب نہ اٹھے گا حشر تک ایسا مفکر و ادیب حق کا مجاہدِ جلیل، دیں کا منادی و نقیب
فکرِ جدید و طرزِ نو کا وہ محقق کتاب
جس کے صحیفۂ کلام کا نہیں دہر میں جواب

ایک حریمِ راز تھی اس کی کتابِ زندگی　　فکر و نظر سے تھی بلند اس کی جنابِ زندگی
آج کہاں ہے دوبر میں اس کا جوابِ زندگی　　آہ برس کے تھم گیا اب وہ سحابِ زندگی

بکھرے ہوئے ہیں چار سو لعل و جواہرِ کمال
اس کے مآثرِ ہنر، اس کے مظاہرِ کمال

اس کا قلم جب اُٹھ گیا لالہ و گل کھلا دیا　　شعر و ادب کے پھول سے صحنِ ورق سجا دیا
شاہدِ فکر و راز کے رُخ سے حجاب اُٹھا دیا　　جلوۂ رنگ رنگ سے گل کدہ جگمگا دیا

عقدہ کشائے فکر و راز چہرہ طرازِ علم و فن
فیض سے جس کے تازہ تھا دانش و فکر کا چمن

آہ وہ کلکِ خوش نگار، لالہ طراز و لالہ کار　　جس کا نوشتہ حسین ایک صحیفۂ بہار
جس کی نگارشِ جمیل شعر و ادب کا شاہکار　　ایک حدیقۂ کمال جس کا ہر اک خطِ غبار

اس کا "حبیب" سے کلام اس کا "صدیق" سے خطاب
نامۂ شوق کی زبان، نغمہ و شعر کی کتاب

علم و ہنر کا تاجدار، خسروِ کشورِ قلم　　بدرِ معانی و علوم، صدرِ معارف و حکم
نوکِ قلم سے گل طراز، نغز نگار و خوش رقم　　جس کا کمالِ معتبر جس کا کلام محترم

قوم کو جس پہ ناز تھا ہاں وہ زعیمِ ممتحن
ایک حکیمِ دیدہ ور ایک کلیمِ طورِ فن

سجنِ فرنگ کا اسیر، قائدِ صاحبِ منیر　　جس کے ثباتِ عزم کی ملتی نہیں کوئی نظیر
لمبح بلند کا فقیر، فکر و دماغ کا امیر　　تھا جو وطن میں کل تلک نظمِ امور کا مشیر

کنجِ لحد میں گوشہ گیر ہو گیا آہ اب وہی
اس کے الم میں سرنگوں کیوں نہ ہو پرچمِ خوشی

اسوۂ یوسفی کی نذر جس کی حیات تھی تمام　　حق کے لیے غم و محن جس کا تھا منصبِ مقام
شکر و رضا کی سرخوشی جس کا شعار تھا مدام　　دار و رسن سے سرفراز، قید و محن سے شاد کام

صبرِ جمیل کی ادا جس کی تھی شانِ امتیاز
عفو و کرم سے دل نواز، جور و ستم سے بے نیاز

آہ کہاں ہے آج اس شانِ فہیم کی مثال　　طبعِ کریم کی مثال، خلقِ عظیم کی مثال
اب نہ اٹھے گی ہند میں ایسے زعیم کی مثال　　ایسے فریسِ دیدہ ور، ایسے حکیم کی مثال

آج ہے بے فروغ فیض بزمِ وطن ترے بغیر
بزمِ وطن ہے محفلِ حزن و محن ترے بغیر

اس کی حیات کو تھا آہ ملتِ حق سے یہ گلہ　　بے خبرِ مقام ہے ہند میں حق کا قافلہ
فکر و شعور سے تہی جس کا ہے عزم و حوصلہ　　رزمِ حیات سے فرار آہ ہے جس کا مشغلہ

جہلِ خطاب سے دیا جس نے سلام کا جواب
سوءِ کلام سے دیا حسنِ کلام کا جواب

جس نے کیں تازہ سنتیں سرکشی و عناد کی　　حق کے خلاف بے پناہ معرکۂ جہاد کی
آہ وہ گرم جوشیاں ملتِ کم سواد کی　　آہ وہ شانِ صبر و شکر بندۂ حق نہاد کی

گالیاں سن کے بھی مدام لب پہ دعائے خیر تھی
عفو و کرم کی کل متاع یعنی منشائے خیر تھی

اب نہ اٹھے گا عارفِ دینِ حجاز پھر کبھی　　آہ ابوالکلام سا واقفِ راز پھر کبھی
ہوگا نہ عندلیبِ فن نغمہ طراز پھر کبھی　　دفترِ علم و معرفت ہوگا نہ باز پھر کبھی

آہ نہ جانی اس کی قدر ملتِ کم شناس نے
مسلمِ کم سواد نے، امتِ ناسپاس نے

غلام رسول مہر

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک نادرِ روزگار شخصیت

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

مولانا کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے۔ بہت کم بڑے آدمی ہیں، جن کے متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہوں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روز و شب کا سلسلہ دورگہ جاری ہے بہت کچھ لکھا جائے گا، تاہم حقیقتِ حال پر نظر رکھی جائے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

ترا، چنانکہ توئی، ہر کسے کجا داند
بقدرِ طاقتِ خود سے کنند ادراک

انسانوں کے درجے

عظیم الشان انسانوں کے مقامات و مدارج ہیں۔ جو اس بنا پر متعین ہوتے ہیں کہ زمانی اور مکانی اعتبار سے ان کے دائرۂ اثر و رسوخ کی کیا کیفیت رہی، بعض افراد خاص اسباب کی بنا پر شہرت پا لیتے ہیں اور ان میں مقام شہرت پر قائم رہنے کے جوہر موجود نہیں ہوتے۔ بعض کو قدرت عزت و احترام کی اونچی گاہوں پر پہنچا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنے مخصوص ماحول سے باہر کوئی قابلِ ذکر حیثیت حاصل نہیں کر پاتے نیز ان کی قدروں کو زمانی اعتبار سے چنداں پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ خاک دانِ تیرہ و تار ایسی شخصیتوں کی جلوہ گری سے بھی زیب و زینت پاتا ہے۔ جو زمان و مکان کے لوحِ قلب پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش ثبت کر جاتی ہیں۔ لیل و نہار کے وہ نقوش مدھم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ابھرتے رہتے ہیں مولانا کا تعلق عظیم المرتبت انسانوں کی اسی آخری صف سے تھا اور ایسے انسان زمانہ کے دور گزر جانے کے بعد ہی عرصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ خواجہ سنائی نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ:-

دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

نادرِ روزگار شخصیت

یقیناً مولانا ایک نادرِ روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوتے ہیں انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا شمار مشکل ہے اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے۔ علم و فضل حقائقِ دین، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری، غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلم نہ تھی اور آج تک اس کی تصدیق و توثیق نہ ہوتی رہی؟ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابلِ توجہ مطبوعہ یا مخطوطہ و کمیاب ذخیرہ ہو،

ہی ان کی نظر سے نہ گزر چکا تھا اور اس ذخیرے کی ہر شق اقتباسات ان کے گنجینۂ حفظ و ضبط میں محفوظ نہ تھی۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور ان کے وہ مطالب ذہن میں بٹھا لئے جو انھیں پسند آ سکے۔ مولانا کے حافظے میں نہ محض تمام مطالب ہی محفوظ تھے بلکہ مشہور مصنفوں کے اسلوب پر بھی حد درجہ گہری نظر تھی۔ جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقائق بیان فرماتے جو اس فن میں درجہ اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سُننے لگا۔ حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ کمال انھوں نے کیوں کر حاصل کر لیا۔

حیرت انگیز کمالات

عربی تو بہر حال ان کی مادری زبان تھی اور حیات مستعار کے ابتدائی دس سال انھوں نے مکۂ معظمہ میں گزارے تھے۔ لہٰذا اسے اہلِ زبان کی طرح بولنے پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ فارسی بھی تازہ واردِ ایرانیوں کے انداز میں بولتے تھے مشہور ایرانی شاعر قاآنی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان اہلِ فرانسیسیوں کی طرح بولتا تھا یہاں تک کہ اسے پردے میں بٹھا دیا جاتا تو کوئی پہچان نہ سکتا کہ فرانسیسی نہیں ایرانی بول رہا ہے یہی ایک مرتبہ مولانا کو ایک ترک مہمان فارسی میں باتیں کرتے سُنا تو حیران رہ گیا۔ گفتگو میں اہلِ زبان کی سی روانی کے علاوہ تلفظ کی لطافت اور لب و لہجہ کی ملائمت کا وہی رنگ تھا جو خوش ذوق ایرانیوں کا خاصہ ہے۔

علوم میں ہمہ گیری

پھر مختلف انسانوں کی طبیعتوں کو مختلف علوم سے مناسبت ہوتی ہے اور انھیں میں وہ درجہ کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ مولانا کی طبیعت کو ہر علم سے مناسبت تھی۔ دین و مذہب، تاریخ و سیر، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، علم الالسنہ، آثار قدیمہ اور خدا جانے کس کس دائرۂ علم و فن میں وہ یگانگی کے درجے پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ طب کی تعلیم بھی باقاعدہ پائی تھی اور دوسرے علوم کے علاوہ طب بھی پڑھاتے رہے۔ جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گذر جاتی تھی۔ اس کے تمام مطالب ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو شعرا کے تذکرے اور دواوین انھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دیکھے ہوں گے۔ شاید ہی کوئی اچھا اور قابلِ توجہ شعر ہو جو انھیں یاد نہ تھا۔ ہم لوگوں نے جن اُردو شعرا کے محض نام سن رکھے تھے اور اُن کا کلام کبھی نہیں دیکھا۔ بلا کر اپنے خیال کے مطابق اسے دیکھنے کے قابل نہ سمجھا۔ مولاناؒ کی تصانیف میں ان کے اشعار بھی جا بجا ملتے ہیں۔ کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں یہ تمام ذخیرے دیکھ جانے کا وقت کب ملا اور بزاروں گراں قدر کتابوں کے مطالعے سے اتنی فرصت کیوں کر میسّر آگئی کہ ان کتابوں کو بھی نظر سے گزار لیا۔ جن کے وجود تک سے اہلِ علم بے خبر ہیں۔ پنجابی زبان کی ایک کتاب "پکّی روٹی" ہے جس میں دینی مسائل سوال و جواب کے انداز میں جمع کئے گئے ہیں۔ قیامِ امرت سر کے دوران میں انھوں نے وہ کتاب بھی پڑھ لی تھی۔

غیر معمولی حافظہ

صلاحیت حفظ و استحضار کے لحاظ سے وہ قدرت کا ایک عجیب و غریب نشان تھے۔ بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ پڑھتے تھے، دماغ کے مختلف خانوں میں حسنِ ترتیب سے چنتے جاتے تھے۔ ہر خانہ ضرورت کے وقت خود بخود کھل جاتا اور بوقت چاہتے اُٹھا لیتے۔ "تذکرہ" انھوں نے صرف حافظے کی بناء پر مرتب فرما دیا تھا۔ بعد میں چند کتابیں منگوا لیں تاکہ اطمینان فرما لیں جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اس کتاب کی دو جلدیں تھیں، مرحوم فضل الدین احمد مرزا نے صرف ایک جلد چھاپی اور مولانا ابھی رانچی میں نظر بند ہی تھے کہ مرزا صاحب کلکتہ چھوڑ کر اپنے وطن پنجاب چلے آئے اور دوسری جلد بھی ساتھ لے آئے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور سعی و تلاش کے باوجود دوسری جلد کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اسی طرح ایک عزیز دوست نے بتایا کہ جس زمانے میں مولانا "وکیل" کے ایڈیٹر تھے۔ طباطبائی مرحوم کی شرح دیوانِ غالب میں انھوں نے سادہ اوراق لگوا لئے تھے اور ان پر مختلف شعروں کی شرح لکھتے جاتے تھے۔ ایک ندیم نے وہ نسخہ مولانا کے علم کے بغیر اُٹھا لیا اور تقسیم ہند کے وقت تک وہ محفوظ تھا تقسیم کے ہنگاموں میں وہ نذرِ آتش ہو گیا۔

خدا کی خاص نعمت

"غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور میں اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ ایک مکتوب میں اپنے محبس احمد نگر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی (صاحبِ مآثر رحیمی) اور صمصام الدولہ (صاحبِ مآثر الامراء) نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ

کی فوجیں بھی آگئیں اور خانِ خاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل جیش کی طاقت و رسوخ سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا۔ چنیں انبوہ دو پیش و فتح آسمانی اگر حادثہ رو دہد، جائے نشاں دہید کہ شمارا دریابیم۔" خانِ خاناں نے جواب دیا تھا۔" زیرِ لاشہ۔"

میں نے فارسی کا یہ فقرہ پڑھا تو احساس ہوا کہ فتح آسمانی "اچھی فارسی معلوم نہیں ہوتی، ممکن ہے اصل میں" فتح آساں نے" (فتح آساں نہیں) ہو۔ میری گذارش کے جواب میں مولانا نے کلکتہ سے لکھا۔

" دولت خاں لودی کا مقولہ محض حافظے سے لکھا ہے لیکن اس میں" فتح آسمانی" ہی ہے۔ یعنی حالت ایسی ہے کہ سرو سامان کی بناء پر فتح کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ آسمان کی مدد ہی سے ہو تو ہو "آساں نے" ہرگز نہیں ہو سکتا۔ . . . اگرچہ دماغ مطمئن تھا۔ خیال ہوا برسوں کی بات ہے۔ اصل مقام نکال کر دیکھ لوں۔ چنانچہ "مآثر الامرا" میں مقام مل گیا اور دولت خاں لودی کا مقولہ ٹھیک ٹھیک وہی نکلا جو حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا۔ طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس مقولے کی پوری محافظت کی تھی اور ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا تھا۔"

کون اس حافظے کو خدا کی خاص نعمت تسلیم کرنے میں تامل کرے گا جس نے تیس برس میں ایک معمولی فقرے کا ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہ ہونے دیا۔

ہر دائرے میں مستقل قدریں

اسے بھی چھوڑ دیئے اور یہ دیکھئے کہ ہر دائرے میں انھوں نے مستقل قدریں قائم کیں۔ جن کا کوئی سراغ ان سے پیشتر کسی دائرے میں نہیں ملتا۔ اگر میں اس بارے میں تفصیلات پیش کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے تاہم ایک دو مثالیں پیش کئے بغیر مدعا واضح نہیں ہو سکتا۔

"الہلال" سے پیشتر تمام جرائد و رسائل (الاماشاء اللہ) امراد ولاسا سے اعانتی رقوم لے لینا غیر مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ قیمت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا تو امرا و رؤسا کے لئے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے درجۂ امتیاز میں کوئی خلل نہ آجائے۔ "الہلال" نکلا تو اس کا پہلا ہی نمبر دیکھ کر ایک مشہور صاحبِ ریاست نے خاص رقم کا چیک مولاناؒ کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ ہی لکھا کہ ہر مہینے اتنی رقم باقاعدہ پہنچتی رہے گی۔ سال بھر کے لئے تو وعدہ سمجھئے اس کے بعد بھی اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

سیر چشمی اور خودداری

مولانا نے شکریے کے ساتھ چیک واپس کر دیا اور لکھا۔

" ہم نے جس قدر کام اپنے ذمے لے لئے ہیں۔ وہ روپے کے بل، پبلک کی قدردانی اور رؤسائے قوم کے جود و سخا کے بھروسے پر نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اعتماد پر جو اپنے دروازے کے سائلوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سن لیتا ہے تو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا۔"

پھر فرمایا۔

" ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ایسوں کی اعانت کر کے آپ کا جی کیا خوش ہوگا۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں

" پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت بیں گھاس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں۔ . . . ہاں اگر اس سے میری رائے اور میرا ضمیر خریدنا مقصود ہو تو بہ ادب واجب عرض ہے کہ ان خزف ریزہ ہائے طلائی کی تو کیا حقیقت ہے، اگر کوہِ نور اور تختِ طاؤس کی دولت بھی جمع کر لیجئے۔ تو تمام آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہیں۔ یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شاہنشاہِ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ خرید چکا۔"

کم از کم اردو اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق عظمتِ خودداری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس اخبار نویسی کے معیار کو آسمان پر پہنچا دیا۔

"الہلال" کی ضمانت کا واقعہ

طلبِ ضمانت کا خیر مقدم "الہلال" سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔

"الہلال" سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولاناؒ نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا۔ جب اطراف ملک سے پے در پے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۳۰ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا۔ "ابتدائے عشق" ساتھ ہی فرماتے ہیں:۔

"انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ بس اس کو چاہئے کہ اپنے کام میں معروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنےٰ اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکامِ وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔"

اس ضمن میں یہ اصول پیش کر دیا کہ حق و صداقت کے لئے کامیاب و منصور ہونا لازم ہے۔ باطل کے ساتھ دنیوی طاقتوں کا کتنا ہی ساز و سامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دیں لیکن بالآخر وہ خاسر و نامراد رہے گا۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ ۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ جسے ۲۰ تک داخل کرنے کی مہلت تھی، لیکن ۲۲ ہی کو داخل کر دی گئی۔

"ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علاحدہ رکھ دیا گیا تھا۔ جس دن "الہلال پریس" کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب تو وقت آگیا تھا اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے..... بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومیٔ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی سے نہیں ہوئی تو آیندہ کی فکر کے لئے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟"

قولِ فیصل

ایسی بے شمار قدریں مولاناؒ نے ہر دائرے میں قائم کیں اور ان سے پیشتر ہماری قومی زندگی میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ وہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں بسلسلہ ترکِ موالات گرفتار ہوئے تھے۔ اس وقت کے قومی فیصلہ کے مطابق انھوں نے بھی دورانِ مقدمہ میں عدالت سے تعاون نہ کیا تھا۔ البتہ آخر میں ایک بیان داخل کیا تھا جو قولِ فیصل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ آج بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیئے تھے۔ مگر کوئی بیان "قولِ فیصل" کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ مجاہدینِ آزادی کے خلاف مقدمے ہر ملک میں چلے اور اکثر نے بیانات بھی دیئے۔ میرے علم کے مطابق آئرلینڈ کے قائدِ آزادی رابرٹ ایمٹ کا بیان بہت پرزور اور پرتاثیر مانا جاتا ہے۔ لیکن 'قولِ فیصل' کے مقابلے میں بھی وہ بالکل بے کیف معلوم پڑتا ہے۔ مولانا نے اس میں حقیقتِ حال واضح کی، آزادی کے لئے ہر جدوجہد کا اقرار کیا۔ بلکہ کہا میں اس جرم کا ارتکاب بہت پہلے سے کر رہا ہوں اور اسے اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ پھر اپنا یہ یقین بھی واضح کر دیا کہ حق کامیاب ہوگا اور باطل اپنی ظاہری قوت کے باوجود ٹھہر نہ سکے گا۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات نے مولانا کے اسی یقین کا ساتھ دیا۔ خدا کی سنت کبھی نہیں بدلی، قدرت کے مقرر کئے ہوئے اصول کی کارفرمائی میں کبھی تغیر نہیں ہوا۔ لیکن یہ بول بول لینا ایک چیز ہے اور اس کارفرمائی پر چٹانوں سے بھی بدرجہا زیادہ مستحکم ایمان و یقین کی روح سے معمور ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

مقامِ دعوت کے تقاضے

"الہلال" کے ابتدائی دور میں بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہوا کہ مولانا کا لب و لہجہ ذرا سخت اور درشت ہے۔ ممکن ہے "الہلال" کی جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت اب بھی بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہو۔ اس غلط فہمی سے محفوظ رہنے کے لئے مولاناؒ کے مقامِ دعوت اور وقت کے عام حالات کو پیشِ نظر رکھ لینا ضروری ہے۔ وہ آزادی اور حق پرستی کی دعوت لے کر اٹھے تھے: "الہلال" اس دعوت کا وسیلہ تھا۔ داعی کا مقام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اپنی ہر بات کو عوام کے دلوں میں اتار دے۔ وہ صرف دماغوں کو اپیل نہیں کرتا بلکہ دماغوں سے کہیں بڑھ کر اس کی اپیل دلوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر بے حسی پائی جاتی تھی۔ ہر طرف جمود نظر آتا تھا۔ حکومت کا رعب دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ ذی وسائل اور ذی رتبہ افراد کے لئے ایک خاص احترام کی فضا موجود تھی۔ خواہ ان کا مسلک و مشرب راہِ حق سے کتنا ہی ہٹا ہوا تھا۔ مولانا کے لئے ایک داعیٔ حق کی حیثیت میں صورتِ حال کو منقلب کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی ضرورت نے انھیں ایک ایسے لب و لہجہ پر مجبور کیا جو درشت نہیں البتہ حد درجہ بے باکانہ ضرور تھا۔ دعوتِ حق کو کامیاب بنانے کا احسن طریقہ یہی تھا کہ وہ نہایت ہراس انگیز اقدامات کو زیادہ سے زیادہ محبوب و دل پذیر بنا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں

نے نفع وسود کو ٹھکرایا اور نقصان و زیاں سے پیار کی دعوت دی ۔ پھولوں کو پامال کیا اور کانٹوں سے محبت کرنے کی صدا بلند کی۔ اس وقت اہل ملک کو قربانی کے لئے تیار کرنا منظور تھا اور قربانی کی دعوت گل پاشیوں کے ذریعے سے کبھی پروان نہیں چڑھی ۔

شانِ استقامت

مولانا کے ایمان و یقین کی طرح ان کی رائے کو بھی پختگی کا بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے کب اپنے ذہن میں ایک مستقل نقشہ تیار کر لیا تھا۔ "الہلال" کے پچھلے نمبر کے افتتاحیے میں ایک اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۱۲ء کے موسم سرما میں الہلال کی چشم بیدار نے ایک خواب دیکھا تھا۔ دنیا کے سامنے ان کے نقشہ عمل کے اجزا ۱۹۱۲ء میں آسکے یعنی جو پروگرام انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں تیار کیا تھا اس پر چوبیس سال کی عمر میں عمل شروع کیا۔ اس وقت سے آزادی حاصل کرنے تک پینتیس سال گزر گئے، سینکڑوں اکابر کی رائیں بدلیں۔ ان کے مسالک و مشارب میں تغیر پیدا ہوا لیکن مولانا نے جو راستہ ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس پر وہ برابر انتہائی دلجمعی سے قائم رہے یہاں اس رائے پر بحث کا کوئی سوال نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ وہ جہاں ایک مرتبہ چٹان کی طرح جم گئے وہاں سے ایک آنچ بھی ادھر اُدھر نہ ہوسکے۔ زندگی کی عزیز ترین متاع ہر دل عزیزی ہے جسے قربان کرنے کے لئے انسان بہ آسانی تیار نہیں ہوتا۔ یہ متاع عزیز انہیں جوانی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس پیمانے پر مل گئی تھی۔ جس کا ایک حصہ بھی اکثر اصحاب کے نزدیک سرمایۂ فخر بن کر حاصل حیات ہوتا ہے اور یہ ہر دل عزیزی ایسی نہ تھی جیسی سیاسی ہنگاموں کے دوران میں پھولوں کے ہاروں، جلوسوں اور نعروں کی شکل اختیار کرکے لیڈروں کے روبرو پیش ہوتی رہی۔ مولانا کی ہر دل عزیزی دلوں کی تڑپ کا جزو بن گئی تھی۔ یہ گراں بہا متاع انھوں نے اپنی رائے کی پختگی اور اپنے مسلک کی استقامت کے سلسلے میں بے دریغ لٹا دی۔ اپنے علم و نظر کے مطابق حق کی خاطر اس بے نظیر حوصلے، اس بے مثال ہمت اور اس بے دریغ قربانی کا نمونہ کہاں مل سکتا ہے؟

علم و عمل کا تاجدار

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجداری و سلطانی کا مرتبہ مل جاتا ہے۔ وہ عمل و عزیمت کے میدان میں کم تر ہی کوئی ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوتِ عمل پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انھیں دونوں دائروں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑے تھے یا عمل میں، انھوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی اور یہ دعوت خوش نما الفاظ، دل نشین تحریرات یا پُر تاثیر خطابت تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی دعوت تھی۔ جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی حرارت سے مخمور تھا۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی۔ اس پر اونچے سے اونچے کا عمل کا نمونہ پیش کیا۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک سے نہیں اٹھتے غالب کیا خوب کہہ گیا ہے۔

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

مضمون بے قصد و ارادہ بہت لمبا ہو گیا۔ سچ ہے:۔

ہمیں عشق است برخود چیدہ چندیں داستاں ورنہ
کہ از معنی یک حرف صد دفتر نے سازد

استغنا اور بے نیازی

تاہم مولانا کی ایک نادر خصوصیت کا ذکر کئے بغیر اسے ختم نہیں کر سکتا یہ اُن کی شان بے نیازی تھی۔ "الہلال" کے دور اول ہی میں دنیا نے تسلیم کر لیا تھا کہ علم و فضل میں ویسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ان سے وابستہ ہو گیا تھا۔ بارہا ان سے التجائیں کی گئیں کہ اپنے سوانح مرتب فرما دیجئے اور اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا بندوبست کر دیجئے انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ نیازمندوں کی التجاؤں کو شرف پذیرائی بھی بخشا۔ پھر ہر اسکیم، ہر منصوبہ اور ہر ارادہ ان کی بے نیازی کی نذر ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو علوم و معارف کا ایک یگانہ حلقہ قائم کر سکتے تھے اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا۔ جن کی کوئی مثال اس وقت تک سامنے نہیں آئی اور خود اُن کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استغناء

یہ بے نیازی تمام نیازمندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی رہی۔ معلوم ہوتا ہے وہ طے کئے بیٹھے تھے کہ اگر انھوں نے علم و عمل کی کوئی قابلِ ذکر متاع چھوڑی ہے تو زمانہ خود اسے محفوظ کرے گا۔ اگرچہ اسے محفوظ کر دینے کا وقت کتنی صدیوں کے بعد آئے گا اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو پھر اس کی حفاظت میں چند لمحے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت کا ضیاع ہوگا۔

نذرِ حقیر

میں اپنے علم و نظر کی بے مایگی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا۔ چند محسوسات و مشاہدات تھے، جو بے اختیار زبانِ قلم پر آ گئے۔ یہ بے رنگ اور بے خوشبو پھول ہیں۔ جنھیں دامن میں سمیٹ کر مولانا کی بارگاہِ عظمت و جلال میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک بے نوا فقیر سلطانِ علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے؟ خدا کرے یہ نذرِ حقیر شرفِ قبول سے محروم نہ رہے۔ اس ذکر کو مرزا غالب کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کی ردیف ضرورتاً بدل لی ہے۔

ہندرا دندِ سخن پیشہ گمنامے بود
اندریں دیر کہن سے کردہ آشنامے بود

مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدارِ سخن تھے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے یگانہ تاجدار تھے۔ مرزا بھی گمنام نہ تھے اور مولانا کے بارے میں بھی کسی کو گمنامی کا وسوسہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا نے اپنے مقام کی برتری اور اس کے شایانِ شان قدر شناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو گمنام کہنا پسند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھیئے۔

زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں ہے۔ اسی طرح غیر معلوم مستقبل میں بھی گردش کرتا رہے گا۔ عام لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور بلند مرتبہ شخصیتوں کے ظہور کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا۔ لیکن ہم تیرہ ذوقی کے جس عہد سے گزر رہے ہیں اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ مولانا کے پایہ کی یا ان سے ملتی جلتی شخصیت پھر پیدا ہوگی؟ اس کائنات کی کوئی بھی شئے فنا کی دسترس سے باہر نہیں۔ بقا صرف اللہ کے لئے ہے۔

یَغفِرُکَ اللہُ

۱۳۷۷ھ

روحی الہ آبادی

قطعۂ تاریخِ وفاتِ حسرت آیات امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نوراللہ مرقدہٗ

اُٹھ گیا آزادِ ذی فضل و کمال — ہو گئی سنسان بزمِ سوز و ساز
چشمِ ناکام تماشائے جمال — گوشِ محرومِ صدائے دل نواز
چھپ گیا علم و ادب کا آفتاب — آ گئی شامِ بلا محشر طراز
جنگِ آزادی کا وہ مردِ جری — سرزمینِ ہند کو تھا جس پہ ناز
تھا غریبوں کا انیس و غمگسار — دردمندانِ وطن کا چارہ ساز
تھا سراپا درد وہ عالی تبار — پیکرِ اخلاق تھا وہ پاک باز
اس کا دل تھا محرمِ رازِ حیات — دور بیں تھی اس کی چشمِ امتیاز
رحلتِ آزاد کی صبحِ ملال — لے کے آئی ہے شبِ ہجرِ دراز
اس کی فرقت میں ہیں آنکھیں خونچکاں — ہے زباں پر یہ دعائے دل گداز
وقفِ عیشِ جاوداں ہو اس کی روح — دے اسے جنت خدائے بے نیاز

یہ ہے روحی اس کی تاریخِ وفات
زیرِ تربت اب ہے محوِ خوابِ ناز

۱۹۵۸ء

سعید احمد اکبرآبادی

ترجمان القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسنِ انشا و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعتِ نظر و مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق، مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُن کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں نظر آتی ہیں لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اس بنا پر اردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن اُن کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے مستنبط احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اُن اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اربابِ علم ان سے استفادہ کریں تو کریں۔ لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشین کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے۔ اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں اُن سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل و توجیہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔ مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیبِ بیان، صحابۂ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب متعین کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں بقول مولانا کے "وضعیت" پائی جاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے اور عام انسانی افکار و خیالات پر اُن کی گرفت مضبوط ہوتی رہی قرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے۔ چنانچہ امام فخرالدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطق، فلسفہ، حکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال مصر کے علامہ جوہر طنطاوی کی ضخیم تفسیر "جواہر القرآن" ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وضعیت یا صناعیت قرآن کی اُس سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر ہر آیت میں نمایاں ہے۔ قرآن اگرچہ عقل کو نظر انداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقۂ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجدانیت کے ذریعہ ہدایت اور اصلاح کا وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے دنیا میں پیغمبر آتے رہے اور جس کے لئے خود قرآن کا نزول ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اُس فطریت اور سادگی کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

قرآن کے اسلوب بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے سائنٹیفک طریقہ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں چنانچہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اُس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آراء کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثار قدیمہ انکشافات جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلباء اور علماء کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطریت اور سادگی اور اس کی روحانیت کے ساتھ فلسفہ و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وضعیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا رہتا ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر عام تفسیروں میں ایک نقص یہ ہے کہ اُن میں معمولی معمولی اور فروعی باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے اُن پر یا تو کلام ہی نہیں کیا جاتا۔ یا کلام کیا بھی تو محض سرسری اور ضمنی۔ جس سے قرآن کا بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا خطاب ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً وحدتِ ادیان۔ اور دوسرے مذاہب اور ان کی الہامی کتابوں کی تصدیق۔ قرآن کی ایسی اہم اور بنیادی تعلیم ہے جس کو اس نے بار بار مختلف طریقوں سے بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن عام مفسرین نے اس پر زیادہ اعتنا نہیں کیا اور جہاں کہیں ایسی آیات آئی ہیں اُن پر سرسری طور سے گزر گئے ہیں۔ متاخرین میں غالباً حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور دوسری کتابوں میں اس حقیقت کو زیادہ اچھالا اور اجاگر کیا ہے اور ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے اس بحث پر نہایت مدلل، واضح اور پُرزور کام کیا ہے اور اس سلسلے میں دین کی اصل حقیقت، عہد بعہد اس کا ارتقاء، شریعت و منہاج کا فرق، دین اور شریعت کا باہمی تعلق، دوسرے مذاہب آسمانی اور ان کی آسمانی کتابوں کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام کی عام دعوت اور انسانیتِ عامہ کی فلاح و بہبود کا اصل راز۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے زورِ قلم کمال بلاغت اور وسعتِ فکر و نظر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اُس پروردگار عالم کا کلام ہے جس کی ربوبیت اور پروردگاری ہر انسان اور ہر شخص کے لئے ہے اور وہ کسی خاص ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں کو توڑنا چاہتا ہے نہ کہ ان میں اور اضافہ کرنا۔ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرف جو دعوت دیتا ہے وہ ایک ایسی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے اس لئے اس کا کام وصل کردن ہے نہ کہ فصل کردن۔

چنانچہ مولانا اسلام کے لفظ کی تشریح بھی اسی وحدتِ ادیان کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں:-

"اس نے (قرآن نے) دین کے لئے الاسلام کا لفظ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے، دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانونِ سعادت انسان کے لئے ٹھہرا دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ کچھ انسان ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاء و قیام کے لئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانونِ عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی روگردانی کریں تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے۔ . . . . . وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔"

(ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۰۸-۲۰۹)

مولانا نے اس بحث کے آخر میں ایک بڑا نکتہ پیدا کیا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں پڑتا کہ کہیں کسی اور جگہ میری نظر سے گذرا ہو۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خود سوال کرتے ہیں کہ:-

"جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو بُرا نہیں کہتا

سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیشہ ان ہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں۔ پھر کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟"

اس سوال کو قائم کرنے کے بعد خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں:۔

"اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی
کہ وہ (قرآن) انہیں جھٹلاتا کیوں ہے بلکہ اس لئے تھی کہ جھٹلاتا
کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ قرآن صرف اسی کو
سچا کہے باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب
کی تصدیق کرتا تھا اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو
سکتا تھا۔"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی پس منظر خود بخود بن گیا یا اس کی تعمیر میں چند خارجی مؤثرات و عوامل کا دخل ہے؟ اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا شروع ایک ایسا دور ہے جس میں عالمِ اسلام نے فکری اور ذہنی طور پر ایک نئی کروٹ لی ہے اس کے اسباب سیاسی بھی ہیں اور علمی بھی۔ دنیا کے عام تمدنی حالات بھی ہیں اور علومِ جدیدہ کا ارتقا بھی! اسی نئی کروٹ کا نتیجہ تھا کہ مصر میں مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا پیدا ہوئے اور ہندوستان میں شبلی اور سرسید۔ مولانا ابوالکلام کی سوانح عمری سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مولانا میں خود اجتہادِ فکر کی کمی نہیں تھی اور دوسری جانب وہ سید رشید رضا اور سرسید احمد خاں دونوں کی تحریروں سے کافی متاثر تھے اور ان کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور مولانا کا ترجمان القرآن ایک ساتھ مطالعہ کرے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے دو ذہن ہیں جو دو مختلف زبانوں میں اظہارِ مطلب کر رہے ہیں۔

متوسلین میں مولانا، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم سے کافی متاثر ہیں "الہلال" اور "البلاغ" کے زمانے میں مولانا کے قلم سے جو مذہبی تحریریں نکلیں ان میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا کے طرزِ بیان والشا

اور قدرت و بلاغتِ کلام کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے خواہ کوئی فکر یا خیال کہیں سے لیا ہو لیکن اس کو اس بسط و تفصیل سے اور مدلل و برہن بیان کریں گے کہ اس فکر کے بانی اور موجد وہی نظر آئیں گے۔

شروع شروع میں جب مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن" چھپ کر آئی تو جیسا کہ پہلے سے توقع تھی۔ جہاں عام طور پر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سراہا گیا مسلمانوں کے ایک طبقے میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔ جو لوگ چار پانچ صدیوں سے اجتہادِ فکر سے محروم ہو کر تقلیدِ محض اور جمودِ ذہنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اُن میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے مجتہدِ فکر کا پیدا ہو جانا اُن کے ہیجان کا باعث ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ترجمان القرآن پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں تک اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اگر ان تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان تنقیدوں کا ماحصل صرف یہ دو چیزیں ملیں گی۔

۱۔ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفاسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے یعنی جہاں قرآن میں کوئی حقیقت مطلق ہے مولانا نے بھی اس کو اسی طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت مقید بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے اس اسلوب سے ان لوگوں کی تشفی تو ہو جاتی ہے جو قرآن کو فقہ و کلام کی فرقہ بندیوں سے بلند و بالا ہو کر پڑھتے ہیں لیکن جن دماغوں پر فقہی مکاتبِ خیال کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ اُن سے الگ ہو کر کسی بات کو سوچ ہی نہیں سکتے اُن کو یقیناً مولانا کے اسلوب و زاویۂ نظر سے اختلاف ہونا چاہیئے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے جس کی حدیث میں مذمت آئی ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک مولانا کی تفسیر کے مآخذ کا سوال ہے اُن کی نسبت مولانا نے خود لکھ دیا ہے کہ:۔

"پہلے اس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو۔
پھر بعد کے مفسروں کی طرف رُخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو
صاف نظر آئے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح
تھا۔ بعد کی دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور اُلجھاؤ
پیدا ہو گئے۔"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل صحابہ و سلف کے ہاں ضرور موجود ہے اور محض ایجاد بندہ نہیں ہے۔ جہاں تک تفسیر بالرائے کا تعلق ہے خود مولانا اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشہ سے صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں"

لیکن تفسیر بالرائے سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اس کو بھی مولانا کی زبان سے سن لیجئے تاکہ مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے میں کوئی الجھاؤ باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:۔

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہوتا پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اول سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا۔ دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلح شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے، اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

اس بنا پر مولانا کو متداول اور مروجہ تفسیروں سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ

"جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا۔ جو اقوال نقل کریں گے، ان میں بہتر قول موجود ہوگا۔ لیکن اس کو نظرانداز کر دیں گے۔"

مولانا کی مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اور دوسرے مفسرین میں جو راہوں کا اختلاف ہے اس کا مبنیٰ کیا ہے؟ اس بنا پر اگر بعض حلقوں میں مولانا کی تفسیر پر نکتہ چینی ہوئی تو وہ ہرگز خلاف توقع اور محلِ تعجب نہیں ہے۔

ترجمان القرآن۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ تفسیر سے متعلق تھا۔ اب چند باتیں ترجمہ کی نسبت سُن لیجئے!۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ اس عبارت کا مفہوم و مطلب سمجھ جائیں۔ مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم اردو میں پائے جاتے ہیں اُن سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور ان سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے تراجم کے برخلاف مولوی نذیر احمد دہلوی نے ترجمۂ قرآن میں دلّی کی بولی ٹھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن کی سنجیدگی اور ثقافت مجروح ہو گئی۔ لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی اور نہ یہ، بلکہ ایک طرف تو قرآن کی عظمت اور اس کی ثقافت کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ نہیں آنے دیتے جو قرآن کے مرتبۂ ثقافت سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں کسی کا محتاج نہیں۔ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا نوٹوں کا بھی اضافہ ہے۔ جن میں مطالب قرآن کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قرآن میں جو مطلب یا جو حکم مجمل تھا اس کی تفصیل لکھی ہے تاکہ قرآن کا اصل مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے دلائل و شواہد کی ضرورت تھی وہاں دلائل و شواہد لکھے ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ بجائے خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص تفسیر کا مطالعہ نہ بھی کرے تو نفس ترجمہ اور اس پر جو نوٹس ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔

پھر ترجمہ اور تفسیر اور یہی نہیں بلکہ مولانا کے عام مذہبی مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت جس پر شاید عام لوگوں کی نظر نہیں پہنچی یہ ہے کہ ان سب میں مولانا کا اسلوبِ بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے۔ اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ تبشیر بھی ہے اور انذار بھی۔ کہیں وہ نسیمِ جاں فزا ہے اور کہیں برقِ صاعقہ فگن۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور قاری میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کا یہ طرزِ ادا، یہ اسلوبِ بیان ان کے ہر مذہبی مضمون میں نمایاں ہے لیکن جہاں تک خاص ترجمان القرآن کا تعلق ہے تو یہ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی ہے اور اسی لئے غالب کا یہ شعر اس پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

روشن صدیقی

امام الہندؒ کی یاد میں

کون یہ آخرِ شب بزمِ سحر سے اُٹھا — نالۂ درد، دلِ اہلِ خبر سے اُٹھا

ہائے کس وقت بجھی شمعِ نہاں خانۂ عشق — شعلۂ غم نفسِ بادِ سحر سے اُٹھا

کون ہے محرمِ اسرارِ مشیت لیکن — اعتبار آج دعاؤں کا اثر سے اُٹھا

ہو گئے قافلۂ اشکِ رواں میں شامل — بارِ اندوہ نہ جب لعل و گہر سے اُٹھا

عظمتِ منبر و محراب جھکی جاتی ہے — کون خلوت کدۂ فکر و نظر سے اُٹھا

تا فلک، سلسلۂ حزن و الم طاری ہے — جس طرف آنکھ اُٹھی درد اُدھر سے اُٹھا

سن لیا جب کہ جدائی ہے یہاں شرطِ وصال — حشر، خود اشک بداماں ترے در سے اُٹھا

علم ہے شاہدِ پنہاں کا حجابِ اکبر — ہاں یہ پردہ بھی ترے حسنِ نظر سے اُٹھا

مہر و خورشید نے آنکھوں سے لگایا اُس کو — کوئی ذرّہ جو تری راہ گذر سے اُٹھا

تو نے تمکینِ خرد، ذوقِ جنوں کو بخشی — ایک الزامِ کہن عشق کے سر سے اُٹھا

مرگ سے راز کھلا تیری دل آرائی کا
اک نیا دور ہے یہ تیری مسیحائی کا

حافظ علی بہادر خاں

مولانا آزاد کے فکر و نظر کی چند جھلکیاں

تحریکِ خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل رہی۔ جیل کی زندگی میں ایک عرصہ تک اُن کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہنے کا موقع ملا اور بارہا اُن سے بحث و گفتگو کا بھی فخر حاصل رہا۔ ان ملاقاتوں اور مذاکروں میں یہ حقیقت مجھ پر ثابت ہو گئی کہ مولانا "حیات بعد الممات" کے فلسفہ کے قائل تھے۔ ایک مقالہ میں خود انھوں نے یہ الفاظ لکھے "درحقیقت یہ ایک قانونِ حیات بعد الممات ہے جو کائنات کی ہر شے پر طاری ہے۔" وہ اکثر قرآن کی یہ آیت پیش کیا کرتے تھے۔ یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی (وہ موت سے زیست اور زیست سے موت پیدا کرتا ہے)۔

اس فلسفہ کی روشنی میں یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی موت دراصل ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

وہ عموماً یہ آیت بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی احیانا بعد اماتنا (سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں زندگی دی بعد اس کے کہ ہم مرچکے تھے)۔

اس لحاظ سے مولانا کی وفات کے بعد اگر ان کی زندگی کے حالات تحریر و تقریر میں اس طرح پیش ہوتے رہیں جو قوم میں نئی روح پیدا کریں تو ان کی وفات کے بعد بھی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور خدمتِ خلق کا رول ادا کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے جو مولانا ابوالکلام کے حالات بیان کرنے میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا رہے ہیں، اور فلسفیانہ انداز میں لطیف نکات پیش کر رہے ہیں لیکن اس مختصر مقالہ میں مجھے چند واقعات سادہ الفاظ میں بیان کرنے ہیں تاکہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان سے سبق حاصل کر سکیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو" والی تحریک سے کچھ دنوں قبل کا واقعہ ہے جب کہ جاپانی فوجیں ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں اور یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ اُن کی یلغار سے ہندوستان شاید ہی محفوظ رہ سکے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان مع صدر کانگریس مولانا ابوالکلام جیل میں تھے۔ ایسے وقت گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر جاپانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اُن کا مقابلہ بھی کانگریس عدم تشدد کے ساتھ کرے گی۔

اس وقت مولانا آزاد نینی سنٹرل جیل الہ آباد میں ایک مختصر سے یارڈ میں تھے جس میں صرف چار کوٹھریاں اور ایک ورانڈا تھا۔ ایک کوٹھری میں مولانا آزاد اور بقیہ تین میں ڈاکٹر کاٹجو، کیشو دیو مالوی اور راقم الحروف رکھے گئے تھے جب گاندھی جی کا مذکورہ بالا اخباری بیان اخبارات میں آیا تو مولانا آزاد کا اضطراب قابلِ دید تھا وہ ہم سے بار بار کہتے تھے "میرے بھائی! یہ تو کانگریس کی پوزیشن ہے ہی نہیں۔ یہ گاندھی جی نے کیسے کہہ دیا۔" پھر فرماتے تھے کہ کانگریس نے تو جاپانیوں کے مقابلہ کے لئے عدم تشدد کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" مجھے مولانا کے وہ سب فقرے یاد نہیں جو وہ رہ رہ کر زبان پر لاتے تھے۔ مگر مطلب یہ تھا کہ کانگریس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک پالیسی ہے جو اُس نے برطانیہ کے اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے اختیار کر رکھی ہے یہ ضروری نہیں کہ جاپانیوں کے مقابلہ میں بھی عدم تشدد کا حربہ موثر سمجھا جائے۔

اتفاق سے میری اور مولانا کی کوٹھریوں کے درمیان ایک مستقل دروازہ کھلا تھا جس کے باعث ہر وقت ایک دوسرے کی حالت آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ جب مولانا ورانڈے میں غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد اپنی کوٹھری

میں داخل ہو سکا تو میں اپنی کوٹھری سے اُن کے اضطراب کا دل چسپ نظارہ کر سکتا تھا۔ وہ کوٹھری میں نہایت بے قرار تھے۔ وہ بار بار یہی کہتے کہ گاندھی جی نے یہ بالکل غلط بات کہہ دی ” ایک بار اپنی کوٹھری سے مجھے مخاطب کرکے بولے ”گاندھی جی کی بھی عجیب حالت ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہی ہماری مشکلات کا باعث ہو جاتے ہیں اور پھر وہی ہماری مشکلات کا حل بھی ہوتے ہیں۔“

اس کے بعد مولانا کی سیاسی زندگی کا ایک اور پہلو نظر آیا۔ انھوں نے کوشش کی کہ ایک تو یہ جیل سے باہر بھیجا جائیں جو صرف خلاف قانونی طریقوں سے ہی ممکن تھی۔ اسی زمانہ میں دو کانگریسی کارکن ایک وکیل اور ایک اسکول ٹیچر سزا پا چکے تھے کہ انھوں نے جیل میں سیاسی لیڈروں کو خفیہ خطوط پہنچانے کی کوشش کی تھی اور مشہور یہ تھا کہ یہ لیڈر بھی مولانا آزاد ہی تھے۔ یہ مسئلہ اُس زمانے کے کانگریسی کارکنوں میں مختلف فیہ تھا کہ جیل میں جانے کے بعد جیل کے قانون اور ڈسپلن کی پابندی کی جا سکے یا نہیں۔ مولانا آزاد اُس گروپ میں تھے جن کے نزدیک خفیہ خطوط کی آمد و رفت اگر وہ انقلاب کے لئے ہو تو جائز ہے۔ چنانچہ جب میں رہا ہونے لگا تو مجھے بھی ایک خط خفیہ طریقہ سے باہر لے جانے کا حکم ہوا تھا مگر پھر مولانا کو اور کوئی آسان ذریعہ مل گیا اور میں اس خطرناک خدمت سے محروم رہا۔

بہرکیف جب مولانا اس فکر میں تھے کہ گاندھی جی تک اپنا پیام پہنچائیں اور اُن کی غلطی پر تنبیہ کریں کہ خبر ملی کہ گاندھی جی الہ آباد تشریف لا رہے ہیں جہاں کملا میموریل اسپتال کا افتتاح فرمائیں گے نیز مولانا سے ملاقات کے لئے جیل میں بھی آئیں گے۔

گاندھی جی اور مولانا کی یہ ملاقات جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں ہوئی تھی جہاں ہم میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ مگر گاندھی جی نے ملاقات کے بعد فوراً ہی ایک انٹرویو اخبارات کو دیا جس میں بتایا کہ پچھلے انٹرویو میں جاپانیوں کے مقابلہ میں عدم تشدد کا حربہ استعمال کرنے کا جو خیال میں نے ظاہر کیا تھا وہ میرا ذاتی عقیدہ تھا کانگریس کا فیصلہ نہیں تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اپنے فیصلہ کا اختیار ہے اور وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب دوسرے روز گاندھی جی کا یہ بیان میں نے پڑھا تو مولانا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے گاندھی جی سے یہ نیا بیان دلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں میں نے اُن کو توجہ دلائی تھی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسٹر جناح کا یہ الزام کتنا غلط تھا کہ مولانا آزاد کانگریس کے یا ہندوؤں کے ”شو بوائے“ ہیں۔ ایک طرف تو گاندھی جی کی انصاف پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف ثابت ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو کانگریس میں خاص اقتدار حاصل تھا اور وہ کانگریس کے منصب، وقار اور روایات کے زبردست محافظ تھے۔

نینی جیل کی زندگی میں مولانا نے چند لکچر بھی ہماری درخواست پر دیئے تھے۔ دوسرے بارکوں سے بھی سیاسی قیدی ان میں شریک ہونے کے لئے آجاتے تھے۔ بعض رفیقوں کے مشورہ پر میں نے ان لکچروں کی بنیاد پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا جس پر خود مولانا نے جگہ جگہ ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ ایک جگہ میں نے ” اسلامی کلچر“ کا جملہ استعمال کیا۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اپنے قلم سے لکھ دیا ”بشرطیکہ اسلام جیسے عالمگیر مذہب کا کوئی کلچر ہو۔“ اس پر میں نے جب مولانا سے گفتگو کی تو یہ پایا کہ اُن کی رائے میں اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہے۔ مختلف ممالک کے لوگوں کے مختلف کلچر ہوتے ہیں اور مختلف زمانوں میں کلچر بدلتے رہتے ہیں مگر ان مختلف ممالک کے لوگوں اور مختلف زمانوں کے لئے اسلام ایک ہی رہتا ہے۔ لہٰذا اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ کلچر ایسا لفظ ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی اور مختلف ملکوں میں مختلف مفکرین نے اس کا استعمال مختلف معنی میں کیا ہے۔

نینی جیل میں یہ عجیب بات میں نے پائی کہ مولانا صبح سے شام تک صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ صرف صبح کے چار بجے ترجمان القرآن کا فائل لے کر بیٹھتے اور اُس کے بعض مسائل پر غور کرتے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے مطالعہ میں والٹیر، روسو، نطشے، گوئٹے اور متعدد سیاسی لیڈروں کے سوانح حیات رہتے تھے۔ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن سے صرف بی۔ اے، ایم۔ اے کی قابلیت والے آدمی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ مولانا کی انگریزی کی قابلیت اتنی ہے کہ ایسی ادق کتابیں سمجھ سکیں۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے اُن کتابوں میں سے بعض کے مسائل پر میں نے مولانا سے سوالات کئے۔ مولانا نے جو جواب دیئے اُن سے معلوم ہوا کہ نہ صرف انھوں نے وہ کتابیں پڑھی اور سمجھی ہیں بلکہ اُن مسائل سے متعلق دوسری بھی بہت سی انگریزی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ فہم مضامین کے اعتبار سے اُن کی قابلیت ایم۔ اے سے زیادہ تھی لیکن انگریزی میں گفتگو بالکل نہیں

کرسکتے تھے۔ ایک بار جیل میں انگریز حاکم (غالباً ڈپٹی کمشنر تھا) آگیا تھا۔ وہ مولانا سے انگریزی میں بات کرتا تھا تو مولانا سمجھ تو لیتے تھے مگر جواب اُردو میں ہی دیتے تھے۔ بعد میں مولانا نے انگریزی بولنے کی بھی کچھ مہارت پیدا کی تھی مگر اس قدر کہ بے تکلف بات چیت کرسکیں میرا خیال ہے کہ مولانا کو انگریزی بولنے میں صرف اس لئے تکلف تھا کہ تحریر و تقریر میں جو بلند معیار اُن کے پیش نظر رہتا تھا اُسے گفتگو میں قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسی لئے مولانا نے شاعری ترک کردی تھی۔ وہ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ جو نہایت اچھے بھی ہوتے تھے لیکن مولانا کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اعلیٰ معیار انھوں نے قایم کیا تھا اُس کے مطابق وہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن ایسے شعر کہنے کے لئے جتنی فرصت درکار تھی وہ انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ مجبوراً انھوں نے شعر گوئی کا شوق ترک کر دیا۔

شعر و شاعری کا ذکر آگیا تو ایک واقعہ اور بھی لکھ دوں، مولانا کی آنکھیں آشوب کر آئیں جس کے باعث اُن کا مطالعہ بند ہوگیا۔ معمول یہ تھا کہ میں اور وہ صبح چار بجے اُٹھتے مولانا اپنے ہاتھ سے چائے تیار کرتے اور پینے کے لئے مجھے ضرور بلاتے۔ وہ دو کپ چائے پی کر ہم الگ ہو جاتے اور اپنا اپنا مطالعہ شروع کر دیتے لیکن جب آنکھیں دُکھنے لگیں تو کبھی تو صبح تک باتوں میں گزر جاتی اور کبھی میں اپنی کوٹھری میں چلا آتا اور مولانا تنہا کچھ سوچتے یا عموماً اشعار پڑھتے رہتے۔ ایک روز چائے کے بعد جب میں اپنی کوٹھری میں آکر مطالعہ میں مشغول ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا اپنی کوٹھری میں چہل قدمی کرتے جاتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں چھوڑتے جاتے ہیں اور میرؔ کی غزل کا یہ شعر بلند آواز سے مزے لے لے کر گاتے جاتے ہیں ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

اوپر بتا چکا ہوں کہ دونوں کوٹھریوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ درمیان میں متصل در کھلا ہوا تھا اور مولانا کی ایکٹنگ کے لئے میں تماشائی تھا۔ مولانا کو ترنگ میں میرؔ کی غزل پڑھتے دیکھا تو سوچا شاید مجھے دیکھ کر مولانا آزادی سے اپنے جذبات کا مظاہرہ نہ کرسکیں لہٰذا میں پلنگ پر لیٹ گیا گویا کہ سو رہا ہوں۔ مگر تقریباً ایک گھنٹہ تک نیم باز آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتا رہا کہ مولانا لہرا لہرا کر غزل کے اشعار پڑھتے تھے اور جب مذکورہ بالا شعر پر آتے تو خود

اُس کی رٹ لگاتے اور وجد میں آجاتے۔ مقطع کو بھی بار بار دہراتے ؎

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم اُن نے تو
قشقہ کھینچا دَیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مولانا کی آنکھیں کیا دُکھنے آئیں کہ میرا نصیب جاگ اٹھا کیونکہ صبح کا مطالعہ تو بند ہوگیا تھا مگر چائے کا دَور ضرور اپنے وقت پر چلتا تھا اُس کے بعد اکثر مولانا کی گل افشانیاں صبح تک جاری رہتی تھیں۔ اگرچہ اُردو زبان میں گل افشانی کا محاورہ کبھی بُرے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر میں اصلی لغوی معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ بلا مبالغہ پھول جھڑتے تھے۔ کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے وسعت داماں بھی بخشتا۔ خیر! جتنا بھی مل گیا اُس کے لئے شکر ادا نہیں کرسکتا۔ اگر اس گفتگو سے جو گاہی کے مختلف پہلو لکھنے لگوں تو سو ڈیڑھ سو صفحات لکھنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا۔

۴ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

جیل کی زندگی میں مولانا کے تبصرے، لطیفے اور پند و نصائح سننے کے متعدد مواقع ملتے تھے۔ دو وقت کھانے کی میز پر، ایک وقت ناشتہ کے ساتھ، اور ایک بار شام کو پانچ بجے کی چائے پر، علاوہ بریں جب اخبارات پڑھ چکتے تھے تو اُس روز کی خبروں پر بھی رائے زنی ہوتی تھی۔ پھر شام کو ہم لوگ بیڈمنٹن کھیلتے اور مولانا کتاب لے کر وہاں نڈسے میں بیٹھتے اور کھلاڑیوں کو داد دیتے۔ کبھی شطرنج جم جاتی تھی۔ دو ایک شاطر دوسرے یارڈوں سے بھی آجاتے تھے۔ مگر عموماً میں ایک طرف ہوتا اور سب مل کر مجھے مات دینے کی ناکام کوشش کرتے۔ میرے مقابلہ پر تو ڈاکٹر کاٹجو یا کرشن کانت مالویہ بیٹھتے تھے مگر چالیں بتانے میں مولانا بھی شریک ہوتے تھے۔ میں سب کو مات دیا کرتا تھا لیکن ایک روز مجھ سے ایسی غلطی چال میں ہوگئی کہ ڈاکٹر کاٹجو نے مات کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مولانا نے بساط الٹ دی اور فرمایا کہ بس اب حافظ جی کو مات ہوگیا اب نہیں کھیلتے اور دوسرے یارڈوں میں بھی شاطروں کو خبر بھجوا دی کہ حافظ جی کو مات ہوگیا " جیل میں تاش بھی ہوتا تھا مگر مولانا اس میں کبھی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے چند الفاظ اُس بارک کے متعلق لکھ دینا ضروری ہیں جس میں مولانا کو قید کیا گیا تھا اور جہاں حسنِ اتفاق سے مجھے مولانا کی رات کی معیت نصیب ہوگئی تھی نیچے منزل

جیل الٰہ آباد کے مضافات میں بہت وسیع جیل ہے۔ اس کے اندرونی وسیع رقبہ کے ایک گوشہ میں چار کوٹھریوں کے گرد احاطہ کی دیوار بنا کر وہ بلاک بنائی ہے جس میں مولانا آزاد کو رکھا گیا تھا۔ اسے جیل کے قیدی "کتا بارک" کہتے ہیں اس لئے کہ اس میں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کو پیٹنے کا پروگرام ہوتا تھا۔ ان کوٹھریوں میں بند کر کے جب ان پر مار پڑتی تھی تو یہ کتنا بھی چیختے اور بھاگتے کتوں کی طرح چلاتے مگر دوسری بارکوں تک آواز پہنچتی تھی اس لئے بلاک کا نام "کتا بارک" پڑ گیا تھا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو کو گرفتار کیا گیا تو یہی چار کوٹھریاں رہنے کو دی گئیں تاکہ وہ عام قیدیوں سے بالکل الگ رہ سکیں اور اُن پر سیاسی اثرات نہ پڑنے پائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو کے لئے انگریزی حکومت نے ایک برانڈا اور بنوا دیا۔ میں جب پہنچا ہوں تو اس میں تین سیاسی قیدی تھے۔ ایک مسٹر کیشو دیو مالویہ، دوسرے بالکرشن شرما "نوین" اور تیسرے مسٹر پالیوال، یہ تینوں اُتر پردیش کے مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ میں اگرچہ بمبئی کا تھا مگر الٰہ آباد میں ایک تقریر کی تھی جس کے جرم میں وارنٹ بھیج کر حکومت نے بمبئی سے گرفتار کرا لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی رہا ہوتا گیا اور ڈاکٹر کاٹجو، آر۔ ایس پنڈت (وجے لکشمی کے سورگباشی شوہر) مولانا آزاد اور ڈاکٹر حسین ظہیر باری باری آتے گئے۔ مولانا کو پہلے تو ایک ہی کوٹھری ملی تھی لیکن بعد میں ہم لوگوں نے مولانا کی تکلیف کا خیال کر کے اُن کو دو کوٹھریاں دے دیں اور دو آدمی ایک میں ہو گئے۔ مولانا ایک کوٹھری بطور غسل خانہ استعمال کرنے لگے۔ ان کوٹھریوں کے رقبہ کا اندازہ یوں کیجئے کہ جس کوٹھی میں مولانا کا انتقال ہوا اُس کے ڈرائنگ روم میں نینی جیل والی چھ کوٹھریاں بن سکتی تھیں۔ اسی احاطہ کے اندر بیڈمنٹن کا کورٹ تھا ہم سب اے کلاس قیدی تھے اس لئے جو کھانا جیل سے ملتا تھا اُس میں اپنے خرچ پر اضافہ بھی کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی پنڈت نہرو کے گھر سے (غالباً وجے لکشمی پنڈت کی طرف سے) کوئی کھانے کی چیز آ جاتی تھی۔ مگر زیادہ تر وہیں کھانا تیار ہوتا تھا۔ احمد نگر کی اسیری کے دوران نیز اپنی کوٹھی پر مولانا معمولی چائے کی بجائے یاسمین سے شوق کرتے تھے مگر نینی سنٹرل جیل میں لپٹن یا بروک بانڈ ہی استعمال ہوتی تھی۔ کبھی اتفاق سے صبح چار بجے کی چائے کے وقت اگر رات کا دودھ خراب ہو گیا یا بلی پی گئی تو پھر مولانا بغیر دودھ کی چائے کا سیٹ نکالتے تھے۔

بمبئی میں آغا حشر کشمیری مشہور ڈراماٹسٹ تھے جو مولانا کے ساتھ تھے منجملہ اور حالات کے مولانا آزاد کے اشعار بھی سُنتے تھے۔ ان میں سے دو ایک شعر مجھے یاد تھے۔ نینی جیل میں میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آیا یہ اشعار اُن کے ہی ہیں اور آغا حشر کی سند پیش کی۔ مولانا یہ کہتے ہوئے اپنی کوٹھری میں چلے گئے کہ "عہدِ جاہلیۃ کی باتوں سے کیا فائدہ؟" ان میں سے دو شعر یہ ہیں ۔

وعدہ وصل بھی اک طرفہ تماشہ کی ہے بات —— میں تو بھولوں نہ کبھی اُن کو کبھی یاد نہ ہو
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ —— پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولانا کبھی کبھی بمبئی بھی رہے ہیں مگر اُن کی سرگرمیاں زیادہ تر کلکتہ ہی میں محدود رہیں۔ بمبئی میں بریلی روڈ پر اُن کے والد کے نام سے ابھی تک مسجد خیرالدین موجود ہے۔ ایک بار تحریک خلافت کے زمانہ میں منبر پہ کھڑے ہو کر میں نے سیاسی تقریر کی تو مجھے سیٹھ عبدالرحمن فیت والا مرحوم نے بتایا کہ اسی منبر پر مولانا آزاد کے والد اپنا خطبہ اس مصرعہ سے شروع کیا کرتے تھے۔

۲۔ سب کا خدا خدا ہے میرا خدا محمدؐ

اس مصرعہ میں مذہبی عقائد کا جو تصور ہے اُس کے خلاف مولانا آزاد نے جس طرح بغاوت کی اُس کا نقشہ مولانا ملیح آبادی کی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں نہایت دلچسپ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ باپ اور بیٹے کے عقائد میں یہ بعد المشرقین بہت ہی دلچسپ ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ مولانا آزاد بالکل "وہابی" ہو گئے تھے۔ اُن کی وسیع الخیالی کا تجربہ مجھے کئی اہم مواقع پر ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر تھا تو میں نے اُس میں تصاویر کی اشاعت شروع کی۔ اس پر مولویوں نے بہت مخالفت کی کیونکہ اُن کے نزدیک فوٹو کی اشاعت حرام تھی۔ مولانا یہ سلسلہ "الہلال" میں شروع کر چکے تھے میں نے اُن سے اخلاقی امداد طلب کی۔ مولانا نے کوئی اعلان تو نہیں دیا۔ مگر پرائیویٹ طریقہ سے بعض سرکردہ مخالفین کو سمجھا دیا اور مجھے چند ایسے مشورے دیئے جو تیر بہدف ثابت ہوئے۔ مثلاً یہ کہ پہلے نظام، سمرنا، مصر قائدین ترکی کے فوٹو شائع کرو جب لوگ عادی ہو جائیں تو آگے قدم بڑھانا۔ اس طرح روزنامہ "خلافت" میں فوٹو چھپنے کا رواج ہو گیا۔

دوسرا واقعہ اُن کی وسعت نظری کا یہ ہے کہ جب کمال اتاترک نے خلیفہ کو جلا وطن کر کے جمہوریت قایم کی تو مولانا نے اس خیال کی تائید کی کہ ایک جمہوری کونسل بھی خلیفہ کی قایم مقام ہو سکتی ہے۔ خلیفہ کی جلاوطنی پر آپ کے اور علی برادران کے درمیان نہایت ناخوشگوار مناقشہ بھی ہوا مگر مولانا نے ایک سلسلۂ مضامین میں کمال اتاترک کے طریق کار کی حمایت کی۔

مسلمانوں میں جس قسم کا پردہ رائج ہے مولانا اُسے غلط سمجھتے تھے۔ جیل میں اس مسئلہ پر کافی گفتگو ہو چکی تھی لیکن جیل سے باہر بھی ایک بار جب میرے دوست خلیل شرف الدین مع اپنی ہمشیرہ کے مولانا کی ملاقات کو گئے تو اُن کی ہمشیرہ کا صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ مولانا نے فرمایا اسلام کا منشا اسی قسم کا پردہ ہے۔

مولانا کا تعلق اسلام کے کسی فرقہ سے نہیں تھا۔ وہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے اور ہر مسئلہ پر اسلام کی تعلیمات کی روح و منشاء کی روشنی میں نظر ڈالتے تھے۔ حال میں کتاب "آزاد کی کہانی" کے چھپ جانے سے، شیعہ فرقہ کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ مولانا اُن کے خلاف تھے لیکن نینی جیل میں ایک واقعہ پیش آیا جو اس غلط فہمی کو دُور کر سکتا ہے۔ جب ہم جیل میں تھے تو لکھنؤ میں مدح صحابہ کا قضیہ چل رہا تھا۔ میرے اخبار روزنامہ "ہلال" میں ایک مقالہ مدح صحابہ کی تائید میں شائع ہوا تھا۔ یہ پرچہ جب جیل میں آیا تو ڈاکٹر کاٹجو نے اس مقالہ میں دلچسپی لی کیونکہ جب وہ یو۔ پی میں وزیر قانون تھے تو انھوں نے مدح صحابہ کے حق میں رائے دی تھی۔ ڈاکٹر کاٹجو کو یہ موقع اُس وقت ملا تھا جب کانگریس نے صوبائی خود مختاری کے دَور میں وزارتیں بنائی تھیں۔ مولانا آزاد مدح صحابہ کی تحریک کے خلاف تھے۔ اور اس بارے میں جمعیۃ علماء اور مجلس احرار دونوں سے اُن کو اختلاف تھا۔ ڈاکٹر کاٹجو نے روزنامہ "ہلال" کا وہ پرچہ مولانا کو دکھایا۔ مولانا مجھ پر خفا ہوئے کہ تمھارے اخبار میں ایسے مقالات کیوں چھپتے ہیں۔ ڈاکٹر حسین ظہیر بھی اس وقت جیل میں تھے۔ میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں تو بمبئی سے اتنی دور آپ کے پاس ہوں مجھ پر "ہلال" کے مقالات کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو سکتی۔ بہرکیف مولانا نے مجھ سے ایک خط بمبئی لکھوا دیا جس میں ادارۂ "ہلال" کو ایسے مقالات شائع کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا کے سامنے کسی وقت بھی کسی خاص فرقہ کی مخالفت یا موافقت کا سوال نہیں تھا۔ وہ ہر معاملہ پر اُس کے حسن و قبح کے لحاظ سے نظر ڈالتے اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر بلا خوف و استقلال اُس پر قایم رہتے تھے۔

میرے نزدیک مولانا آزاد کی شمولیت کانگریس سے پہلے کا سب سے اہم واقعہ ۱۹۱۲ء میں پیش آیا جب کہ وہ یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ منعقدہ لکھنؤ میں مولانا محمد علی کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ذاتی تجربات کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے نتائج کا اثر مولانا کی تمام زندگی پر پڑا۔ "الہلال" میں اس اختلاف پر مولانا نے نہایت رنگین سلسلۂ مضامین "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے لکھا۔ جواب میں علی برادران نے مولانا کے مقابلہ میں محاذ قایم کیا۔ بدقسمتی سے چار برس روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر رہنے کے باعث میرا دامن مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ عقائد مولانا آزاد سے ملتے تھے مگر زندگی مخالف کیمپ میں گذرتی تھی۔ میں نے یہ پایا کہ گو مولانا آزاد نے محض قابلیت کے زور سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اپنا ایک بلند مقام بنا لیا مگر بڑی حد تک اُن کو عام پلیٹ فارم چھوڑ دینا پڑا۔ بہت لوگوں کو یہ شکایت رہی کہ ہندوستان کے اعلیٰ ترین خطیب ہوتے ہوئے بھی مولانا بہت کم عوامی پلیٹ فارم پر آکر تقریر کرتے ہیں۔ لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ پلیٹ فارم پر علی برادران کا قبضہ تھا جو مولانا کو پلیٹ فارم سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا نے بھی اس کا احساس کیا اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے "پنجاب پارٹی" بنائی۔ دراصل مجلس احرار کی تنظیم میں بھی مولانا آزاد کا اشارہ شامل تھا مگر مجلس احرار بہت جلد ایسی راہوں پر پڑ گئی جو مولانا کو پسند نہیں تھیں۔ نینی جیل میں پنجاب کے بعض لیڈر مولانا سے ملنے آئے اور اس جیل انٹرویو کے بعد انھوں نے مجلس احرار سے علٰحدگی کا اعلان کیا مثلاً جناب داؤد غزنوی صاحب نے ہمیشہ کے لئے مجلس احرار کو نینی جیل کی انٹرویو کے بعد ہی چھوڑا ہے۔ پلان یہ تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، محمد داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر بعض اکابر اجتماعی طور سے مجلس احرار سے الگ ہو کر صرف کانگریس میں شریک رہیں مگر پلان پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔

بہرکیف علی برادران اور اُن کے ساتھی علانیہ الزام لگاتے تھے کہ مولانا

آزاد نے "پنجابی ٹولی" کو ہم سے جوڑ دیا ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم اس پنجابی ٹولی کے لیڈر قرار دیئے جاتے تھے۔

علی برادران اور مولانا آزاد کی کشمکش کا اثر یہ ہوا کہ مولانا آزاد کی اُن تقریروں سے دنیا محروم ہوگئی جو "الہلال" والی اُردو میں ہوتی تھیں اور جنھوں نے اُن کو "ابوالکلام" بنایا تھا۔ کانگریس کے مشترک پلیٹ فارم پر انھوں نے سادہ اُردو بلکہ ہندوستانی میں اظہارِ خیالات شروع کر دیا جس میں معنویت ضرور ہوتا تھا مگر وہ جادو کہاں جو سامعین کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔

مولانا کی زندگی اور اُن کی تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ کانگریس میں شامل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے سے وہ کانگریس کے رجحانات کو پسند کرتے تھے۔ مثلاً ۲۶ فروری ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں مسلمانوں کی نئی بیداری پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا:

"مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیم بنگال کی منسوخی سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے جن کو کانگریسی، باغی، بے وفائے قوم، مفسد اور اسی طرح بعض اصطلاحاتِ خاص سے یاد کیا جاتا تھا۔"

اس اقتباس میں غور کیجئے کہ "کانگریسی" کا استعمال کس پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۱۳ء کی تحریر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس میں شرکت سے بہت پہلے اُن کے رجحانات کانگریسی تھے۔

جیل میں مذہبی مسائل پر مولانا سے اکثر گفتگو ہو جاتی تھی مگر یہاں اُس کا تذکرہ مناسب نہیں ہوگا۔ لیکن ایک ادبی مسئلہ کی طرف اشارہ کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ عید کو جب میں ملاقات کے لئے گیا تو موقع پاکر ایک سوال کر بیٹھا جس کا جواب تو انھوں نے دیا مگر ادھورا کیونکہ دوسرے لوگ آگئے۔ سوال اس بارے میں تھا کہ جناب غلام رسول مہر نے جو کتاب غالب پر لکھی ہے اُس میں غالب کے گھر کو قمار خانہ اور غالب کا جواریوں سے نال وصول کرنا ثابت کرنے کے لئے مولانا آزاد کی سند پیش کی ہے اور مولانا آزاد نے نواب لوہارو کی شہادت پر بھروسہ کرکے غلام رسول مہر کو اس بارے میں تحریر دی ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ نواب لوہارو کی شہادت قابلِ اعتبار نہیں بلکہ Tainted (مجروح) ہے کیونکہ غالب کی گرفتاری کے بعد خاندان لوہارو نے ایک مبینہ جواری کے ساتھ اپنے ہر تعلق سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔ حالاں کہ خاندان لوہارو سے غالب کے تعلقات کا سب کو علم ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس اعلانِ بیزاری کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اُس خاندان کے ایک فرد نے مولانا کے سامنے غالب کے متعلق ایسا بیان دیا ہو۔

مولانا نے جواب کا آغاز اس طرح کیا تھا کہ غالب کا خرچ بہت تھا اور آمدنی کم تھی اس لئے انھوں نے اپنے گھر شہر کے جواریوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ آمدنی کا سلسلہ قایم رہے۔ ایسے حالات میں خاندان لوہارو کے ایک ذمہ دار آدمی کی شہادت کافی ہے۔ خصوصاً جب کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہ بولیں گے۔ ابھی مولانا کہہ ہی رہے تھے کہ چند آدمی آگئے۔ اور تھوڑے انتظار کے بعد مجھے رخصت ہو جانا پڑا۔ مگر مولانا کے جواب سے مجھے ذرا بھی تشفی نہ ہوئی۔

میں نے مولانا کے سامنے ایک اور وقت مرزا ابوالفضل کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودوں کے بارے میں بھی چند گزارشات پیش کی تھیں اور مولانا نے ضروری کارروائی کرنے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ میں نے بمبئی کے متعلقہ حضرات مثلاً عبدالحکیم صاحب (مالک شرف الدین الکتبی و اولادہ) کو یہ خوشخبری بھی پہنچا دی تھی۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس اہم کام میں مولانا نے کیا اقدام کئے

مولانا کی زندگی کے سب واقعات جو میرے تجربہ میں آئے ایک مقالہ میں نہیں سما سکتے اس لئے یہاں بس کرتا ہوں ؎

تو مپندار کہ ایں قصہ بخود می گویم گوش نزدیک لبم آر کہ آواز ے ہست

شمیم کرہانی

خضرِ حیات

لیٹا ہے آج خاکِ وطن پر وہ کوہِ عزم
پربت کا دل اداس ہے گنگا کی آنکھ نم
یکجا ہیں سوگوار صنم خانہ و حرم
خم ہے جبینِ پرچمِ ہندوستاں بہ غم
مشرق کی صبحِ نو کا اُجالا چلا گیا
فرزندِ ارجمندِ ہمالا چلا گیا

وہ اُٹھ گیا، وطن کو ملا جس سے اپنا رنگ
جس نے حیاتِ عصر کو بخشی نئی اُمنگ
دل جس کا کوہِ ہند تھا، خوں جس کا موجِ گنگ
دانش نے جس کی توڑ دیئے جادوئے فرنگ
خضرِ حیات و رہبرِ بیدار چل دیا
ہندوستاں کا قافلہ سالار چل دیا

جس نے جنوں کو عام کیا وہ ابوالکلام
جس نے خرد کا کام کیا وہ ابوالکلام
مغرب کو جس نے رام کیا وہ ابوالکلام
مشرق کا جس نے نام کیا وہ ابوالکلام
ہر نا امید دل کو جو اُمید دے گیا
شامِ وطن کے ہاتھ میں خورشید دے گیا

دانش میں طاق، فن میں یگانہ تھی جس کی ذات
اک روزگارِ نو کا ترانہ تھی جس کی ذات
جہانِ فریبِ جنوں کا فسانہ تھی جس کی ذات
دنیا تھی جس کی ذات، زمانہ تھی جس کی ذات
بے تاب ایک دل میں جہاں کی حیات تھی
ذاتِ ابوالکلام تھی یا کائنات تھی

پرسانِ حال، شامِ غریباں کے واسطے
افسانہ گو، بہارِ حبیباں کے واسطے
افسوں طرازِ بزمِ خطیباں کے واسطے
سالارِ کاروانِ ادیباں کے واسطے

یکتا علوم و فن میں، یگانہ ثبات میں
شعلہ جہادِ زیست میں، شبنم صفات میں

دانش میں اس کی جذب تھا نورِ مہِ منیر
ظلمت میں پھینکتا تھا تخیل کرن کے تیر
حُسنِ سخن گلال تھا، رنگِ سخن عبیر
تیشے سے کوہکن کے اُبلتی تھی جوئے شیر

فن کے نئے نقوش جو ایجاد کر گیا
وہ بیستونِ فکر کا فرہاد مر گیا

مسند نشیں، مجاہدِ باطل شکار بھی
دُنیائے انقلاب کا پروردگار بھی
قرآن کا مفسرِ حکمت شعار بھی
نقاد بھی، مصنفِ جادو نگار بھی

اتنے تضاد اور اک انساں کی ذات میں
ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں

دل میں عمل کا جذبۂ محکم لئے ہوئے
آنکھوں میں دردِ شوق کی شبنم لئے ہوئے
ہمراہ، انقلاب کا عالم لئے ہوئے
ہاتھوں میں استقلال کا پرچم لئے ہوئے
جس رُخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا
ظلمت کدے کو مطلعِ انوار کر دیا

ذوقِ نظر، لطافتِ گل سے دوچند تھا
لہجہ نبات و شہد، سخن شیر و قند تھا
رُتبے میں مہر و ماہ سے بھی کچھ بلند تھا
لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا

دیتا نہ تھا گماں کو رسائی یقین پر
تاروں پہ تھی نگاہ قدم تھے زمین پر

اس کی نوا میں غنچۂ خنداں کی نغمگی
شامِ نشاط و صبحِ بہاراں کی نغمگی
صحنِ چمن کی جوئے خراماں کی نغمگی
دشتِ جنوں کے شہپرِ جنباں کی نغمگی

وہ نغمگی کہ بانگِ درا جس کا نام تھا
جس کی تپش سے قافلہ بت خرام تھا

آواز کی تھی گونج کہ بادل کی تھی گرج
ہر سانس اک جہاد تھی ہر گام ایک حج
کیا زندگی کی شان تھی کیا بانکپن کی دھج
رہتی تھی منچلے کی جبیں پر کلاہ کج

مردِ فقیر، شوکتِ شاہانہ لے گیا
صحرا میں جتنا رنگ تھا دیوانہ لے گیا

بے شیشہ و چراغ تھی گو زندگی کی رات
سینے میں ضو فشاں تھی مگر مشعلِ حیات
فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شش جہات
چلتا تھا ساتھ ساتھ جہانِ تجلیات

نقشِ قدم تھے مہر کا پرتو لئے ہوئے
اک صبح کا مزاج تھی نئی ضو لئے ہوئے

وہ عہدِ طوق و دار، وہ ہنگامِ قید و بند
وہ حریت کا شور، وہ زنداں کا زہر خند
وہ ہر فضا پہ دام، وہ ہر زیست پر کمند
لیکن مقامِ دار سے گزرا وہ سربلند
ہمت جو آس کی ہمدم و دمساز ہو گئی
اک سر خمیدہ قوم سرافراز ہو گئی

کیا دورِ اضطراب تھا، کیا گردشِ مدام
زنداں میں اک قدم تو بیاباں میں ایک گام
بچپن حصولِ ہوش و خرد میں ہوا تمام
گزری جنوں میں عہدِ جوانی کی صبح و شام
فصلِ شباب، تیشہ زنی میں گزر گئی
پیری تمام کوہ کنی میں گزر گئی

ہر راستے میں سنگ، ہر اک رہگزر میں خار
اپنوں کا وہ سلوک کہ دشمن ہو شرمسار
ملت کے اس عناد کے باوصف زینہار
خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گیا غبار
تھی کون سی وہ بات جو وجہِ محن نہ تھی
لیکن جبینِ عزم پہ کوئی شکن نہ تھی

ملت کے طعن و طنز سے دم بھر نہ تھا فراغ
ہر لحظہ ایک زخم تو ہر لحظہ ایک داغ
پھر بھی نہ دل تھکا نہ فسردہ ہوا دماغ
موجِ ہوائے تند سے لڑتا رہا چراغ
آندھی کبھی کبھی جو بلا خیز ہو گئی
کچھ اور بھی چراغ کی لَو تیز ہو گئی

تازہ نہیں یہ شیوۂ ابنائے روزگار
اکثر کہا گیا ہے زمانے میں گُل کو خار
گم ہو گئی ہے شور میں ہادی کی ہر پکار
حق گو کو دی گئی ہے سزائے صلیب و دار
"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود"

"منصور حوصلوں" کو مگر کیا ہراسِ دار
ہوتے ہیں شاد دیکھ کے میدانِ کارزار
دائم کفن بدوش رہا مردِ جاں نثار
مقتل میں جب گیا تو غزل خواں و نغمہ بار
ہر دم یہ دُھن کہ دشت کوئی پُرخطر ملے
کم ایسے روزگار میں شوریدہ سر ملے

ہمت قوی، دماغ توانا، نظر بلند
منزل حسین، عزم جواں، رہگزر بلند
یوں کر گیا وطن کو بشانِ دگر بلند
ہند ہے سرفراز مسلماں ہے سربلند
"نے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا"

منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا راہبر
جس کی حیات آگ تھی، جس کا لہو شرر
جس کے نقوشِ پا سے چراغاں تھی رہگزر
غمگیں ہیں جس کے صدمۂ ہجراں سے دشت و در
صحنِ فضائے ہند ہے اور گردِ یاس ہے
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

پرسانِ حال، شامِ غریباں کے واسطے
افسانہ گو، جہانِ حبیباں کے واسطے
افسوں طرازِ بزمِ خطیباں کے واسطے
سالارِ کاروانِ ادیباں کے واسطے
یکتا علوم و فن میں، یگانہ ثبات میں
شعلہ جہادِ زیست میں، شبنم صفات میں

دانش میں اس کی جذب تھا نورِ مہرِ منیر
ظلمت میں پھینکتا تھا تخیل کرن کے تیر
حسنِ سخن گلال تھا، رنگِ سخن عبیر
تیشے سے کوہکن کے ابلتی تھی جوئے شیر
فن کے نئے نقوش جو ایجاد کر گیا
وہ بیستونِ فکر کا فرہاد مر گیا

مسند نشیں، مجاہدِ باطل شکار بھی
دنیائے انقلاب کا پروردگار بھی
قرآن کا مفسر، حکمت شعار بھی
نقاد بھی، مصنفِ جادو نگار بھی
اتنے تضاد اور اک انساں کی ذات میں
ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں

دل میں عمل کا جذبۂ محکم لئے ہوئے
آنکھوں میں دردِ شوق کی شبنم لئے ہوئے
ہمراہ انقلاب کا عالم لئے ہوئے
ہاتھوں میں استقلال کا پرچم لئے ہوئے
جس رخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا
ظلمت کدے کو مطلعِ انوار کر دیا

ذوقِ نظر، لطافتِ گل سے دوچند تھا
لہجہ نبات و شہد، سخن شیر و قند تھا
رتبے میں مہر و ماہ سے بھی کچھ بلند تھا
لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا
دیتا نہ تھا گماں کو رسائی یقین پر
تاروں پہ تھی نگاہ، قدم تھے زمین پر

اس کی نوا میں غنچۂ خنداں کی نغمگی
شامِ نشاط و صبحِ بہاراں کی نغمگی
صحنِ چمن کی جوئے خراماں کی نغمگی
روحِ جنوں کے شہپرِ جنباں کی نغمگی
وہ نغمگی کہ بانگِ درا جس کا نام تھا
جس کی تپش سے قافلہ مست خرام تھا

آواز کی تھی گونج کہ بادل کی تھی گرج
ہر سانس اک جہاد تھی، ہر گام ایک حج
کیا زندگی کی شان تھی، کیا بانکپن کی دھج
رہتی تھی منچلے کی جبیں پر کلاہ کج
مردِ فقیر، شوکتِ شاہانہ لے گیا
صحرا میں جتنا رنگ تھا دیوانہ لے گیا

بے شیشہ و چراغ تھی گو زندگی کی رات
سینے میں ضو فشاں تھی مگر مشعلِ حیات
فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شش جہات
چلتا تھا ساتھ ساتھ جہانِ تجلیات
نقشِ قدم تھے مہر کا پرتو لئے ہوئے
اک صبح کا مزاج تھی نئی ضو لئے ہوئے

وہ عہدِ طوق و دار، وہ ہنگامِ قید و بند
وہ حریت کا شور، وہ زنداں کا زہرخند
وہ ہر فضا پہ دام، وہ ہر زیست پر کمند
لیکن مقامِ دار سے گزرا وہ سربلند
ہمت جو اُس کی ہمدم و دمساز ہوگئی
اک سرخمیدہ قوم سرافراز ہوگئی

کیا دَورِ اضطراب تھا، کیا گردشِ مدام
زنداں میں اک قدم تو بیاباں میں ایک گام
بچپن، حصولِ ہوش و خرد میں ہوا تمام
گزری جنوں میں عہدِ جوانی کی صبح و شام
فصلِ شباب، تیشہ زنی میں گذر گئی
پیری تمام کوہ کنی میں گذر گئی

ہر راستے میں سنگ، ہر اک رہگزر میں خار
اپنوں کا وہ سلوک کہ دشمن ہو شرمسار
ملت کے اس عناد کے باوصف زینہار
خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گیا غبار
تھی کون سی وہ بات جو وجہِ محن نہ تھی
لیکن جبینِ عزم پہ کوئی شکن نہ تھی

ملت کے طعن و طنز سے دم بھر نہ تھا فراغ
ہر لحظہ ایک زخم تو ہر لحظہ ایک داغ
پھر بھی نہ دل تھکا نہ فسردہ ہوا دماغ
موجِ ہوائے تند سے لڑتا رہا چراغ
آندھی کبھی کبھی جو بلاخیز ہوگئی
کچھ اور بھی چراغ کی لَو تیز ہوگئی

تازہ نہیں یہ شیوۂ ابنائے روزگار
اکثر کہا گیا ہے زمانے میں گُل کو خار
گُم ہوگئی ہے شور میں ہادی کی ہر پکار
حق گو کو دی گئی ہے سزائے صلیب و دار
"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود"

"منصورِ حوصلوں" کو مگر کیا ہراسِ دار
ہوتے ہیں شاد دیکھ کے میدانِ کارزار
دائم کفن بدوش رہا مردِ جاں نثار
مقتل میں جب گیا تو غزل خوان و نغمہ بار
ہر دم یہ دُھن کہ دشت کوئی پُرخطر ملے
کم ایسے روزگار میں شوریدہ سر ملے

ہمت قوی، دماغ توانا، نظر بلند
منزل حسین، عزم جواں، رہگزر بلند
یوں کر گیا وطن کو بشانِ دگر بلند
ہندو ہے سرفراز، مسلماں ہے سربلند
"نے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا"

منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا راہبر
جس کی حیات آگ تھی، جس کا لہو شرر
جس کے نقوشِ پا سے چراغاں تھی رہگزر
غمگیں ہیں جس کے صدمۂ ہجراں سے دشت و در
صحنِ فضائے ہند ہے اور گردِ یاس ہے
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

محمد یونس خالدی

امام الہند مولانا آزادؒ — سفر اور مقصدِ سفر

"۱۹۱۲ء میں جب کہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آیندہ زندگی کے لئے ایک "مذہب عمل" قرار دے لوں، خدمتِ ملک و ملت و تشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے، اصولِ عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانش مند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے۔ اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر، اپنے سفر کا رُخ، اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے۔"

(مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب)

پھر یہ بھی یاد رہے کہ

"سفر دو ہیں، ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا، اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیں، جب انھوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تو ان کا سفر پورا مقصود تک پہنچ گیا، اور وہ کامیاب ہو گئے اب ان کے لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں؟ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے، اور اس کے جس مسافر نے اس مقصود کو پا لیا۔ اس نے اپنا کام پورا کر دیا، یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں، ایک ہی ہے۔"

(تازہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۴۲ء)

باقی رہا مقصد کا سفر، تو بلا شبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے، لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو بیج بوتا ہے۔ خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروان مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔"

(تازہ مضامین)

جب یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں مذہب عمل کا تعین کس طرح کیا جائے اور کیا کیا جائے؟ لیکن جس کی زبان قلم سے یہ صدا بلند ہو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ میرا مذہب عمل "ملک کی آزادی یا موت ہے۔" اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

یہ آواز ہندوستان میں پہلی آواز تھی، اس لئے حیرت و استعجاب کے ساتھ سنی گئی، ہر سننے والے نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ جو "مذہب عمل" متعین کیا گیا ہے۔ اور اشخاص کے سفر کی جو منزل بتلائی جا رہی ہے کیا واقعی کسی شخص واحد کا یہ مذہب ہو سکتا ہے اور کیا کوئی شخص اس راہ پر چل سکتا ہے؟

مگر جواب دے تو کون دے!

آخر کار وہی انسان آگے بڑھتا ہے اور پورے جلال کے ساتھ ہندوستان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

"میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں" (مسئلہ خلافت)

. . . . .

"ملک کی آزادی یا موت" یہ راگنی ہے وقت کی راگنی

ہے، ملک اس کے لئے تیار نہیں۔"

یہ آواز کسی ایک فرد کی آواز نہ تھی ہر شخص کی زبان پر یہی الفاظ جاری تھے۔ عوام سے شکوہ کیا جائے تو کس طرح کیا جائے مدبرین عصر کی زبانوں پر یہی کلمات تھے۔ ان حالات میں "مرد کار" آگے بڑھتا ہے، اور مدبرین زمانہ کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ

"ہمارے زمانے کے اکثر مدبر اس امر کو ایک مسلم الثبوت مسئلے کی حیثیت سے پیش کر دیا کرتے ہیں کہ کسی قوم کے لئے اس وقت تک آزاد ہونا مناسب نہیں، جب تک وہ اپنی "حریت" کے صحیح استعمال کے لائق نہ ہو جائے۔

یہ مقولہ اس احمق کی زبان سے زیادہ موزوں معلوم ہوگا جو پرانی روایت کے مطابق تیرنا سیکھے بغیر پانی میں قدم نہیں رکھنا چاہتا، پس اگر قوم حریت (آزادی) کے لئے اتنے دنوں تک انتظار کرے کہ جب حالت غلامی ہی میں پوری عاقل اور ذی ہوش بن جائے، تو اس کو تا ابد صرف انتظار ہی کھینچنا پڑے گا، وہ دریا میں اترنے کے لئے شناوری کے سیکھنے کا انتظار کرے گی اور شناوری بغیر دریا میں اترے تا قیامت نہ آئے گی۔"

(انتخاب البلال ص ۱۵)

لیکن مدبرین زمانہ نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ یہ کہنا شروع کر دیا کہ ایک آزادی کی جنگ کے نتائج آج تک بھگت رہے ہیں، اب جو جنگ لڑی جائے گی وہ ہم کو کہیں کا نہیں رکھے گی۔ ہم کسی نئے انقلاب کے لئے تیار نہیں یہ غلامی ایک نعمت ہے اس میں ہم کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ دنیا میں جو انقلاب آتا ہے وہ تباہیوں اور بربادیوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ یہ آوازیں اس کے کانوں تک پہنچیں۔ ایک اضطراب کی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے کہا:۔

"گو اکثر انقلاب کی ابتدا نہایت خراب دیکھی جاتی ہے مگر قوم جب تک آزادانہ زندگی بسر نہ کرے وہ آزادی کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہو سکتی" (انتخاب البلال ص ۱۲)

اس کی یہ دلیل ایک معقول دلیل تھی۔ مخالفت کرنے والوں نے سوچنا شروع کر دیا، شاید بہت جلد وہ وقت آ جاتا کہ پورا ملک اس کا ہمنوا بن جاتا کہ ملک کے قلب نے کہا کہ اس دور میں آزادی کا نام لینا اپنے کو مجرم بنوانا ہے۔ ہندوستان طاقت ور ظالمانہ اقتدار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں وہ مجرم بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

لیکن "آزادی یا موت" کا متوالا جو شخصی سفر اور "مذہب عمل" کی حقیقت انسانی ماغوں سے منوانے کے لئے بے چین تھا، وہ بول اٹھا۔

"ہر قوم کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ جب اس کا ہر فرد حکومت کے نزدیک مجرم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے جرم سے توبہ کرتی ہے اور حق و آزادی کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ قوم کی آزادی کے یہی معنی ہیں کہ غیروں کی حکومت کا خاتمہ ہو، پس ظاہر ہے کہ اجنبی حکمرانوں کے نزدیک جرم اور بغاوت کی اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

ہندوستان بھی آزادی کے لئے بے قرار ہے اس لئے کب کا مجرم ہو چکا ہے" (تذکرہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

مگر اس کی باتوں پر جس طرح دھیان دینا چاہئے تھا۔ اس طرح دھیان نہیں دیا گیا، اور سنی، ان سنی کو برابر کرکے "کامریڈ ما ہمعدوں" نے کہنا شروع کر دیا کہ انگریزی حکومت اور اس کی برکات کا مقابلہ دنیا کے آزاد ملکوں سے کرو، اور دیکھو کہ یہاں کی غلامی دنیا کی آزادی سے کس قدر بلند ہے۔ تعلیمی، سماجی، اصلاحی ادارے قایم کرنے کا ہم کو اختیار حاصل ہے۔ مندر، مسجد، گرجے، گردوارے آزاد ہیں۔ حکومت ہر گوشۂ حیات میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اس سے بڑی آزادی اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تقریر بڑی خوش نما تقریر تھی اور دلائل بھی ناقابل تردید دلائل تھے۔ لیکن جس طبیب حاذق نے نبض پر ہاتھ رکھنے سے پہلے چہرے سے مرض کو بھانپ لیا ہو۔ اس کے سامنے ان دلائل کی کوئی قیمت نہیں۔ اس نے کہا کہ:۔

"ایک حکومت ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر لیتی ہے۔ اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے۔ اس کی قوت کو فنا کر دیتی ہے۔ اس کی اخلاقی حالت برباد کر دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل بالکل یک قلم سرچشمہ فساد ہے۔

لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کرنی ہوں،
اور اسی کی اصلاح و عروج کے لئے دوسری قوم کو اپنا غلام بناتی
ہوں۔

پس جو شخص اس حکومت کے خلاف جہاد کرتا ہے، اس کو
مفسد قرار دیتی ہے۔" (مضامین البلاغ)

لیکن

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی
انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی، کہ
خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لئے کیسے
ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ دئے جائیں۔ لیکن وہ غلامی ہی ہے۔ اور
خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے، پس میں موجودہ
گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا، اور اپنا ملکی، مذہبی، اور
انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں"

(قول فیصل " بیان عدالت)

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کی جنگ لڑے تو کون لڑے
اس ملک میں متعدد قومیں ہیں، لیکن یہاں کے عوام دو اکثریتوں میں بٹ
جاتے ہیں۔ ایک کا نام ہندو ہے اور ایک کا نام مسلمان، دونوں کی تہذیب
دونوں کی معاشرت میں شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف ہر گوشۂ حیات
میں ظاہر ہے۔ اس لئے دونوں مل کر آزادی کی جدوجہد میں کیسے حصہ
لے سکتے ہیں؟

یہ سوال ایک ایسا سوال تھا، کہ جس نے اس پیکرِ عزیمت کو ایک لمحہ
کے لئے غور و فکر میں ڈال دیا۔ اس نے اپنی رہنمائی کا ہاتھ جس رہنما کے ہاتھ
میں دیا تھا۔ اس کی تعلیم نے رہنمائی کی۔ تفصیلی جواب سے قبل اس نے پرجوش
لب و لہجہ میں کہا کہ:۔

"ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے۔
صداقت و حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لئے،
ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور ان کی یک جہتی
ضروری ہے۔" (خطبہ صدارت آگرہ)

اس اجمالی جواب نے مخالفین میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی۔ اور اس
جھنجھلاہٹ کے نتیجہ میں ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا، کہ یہ نعرہ مذہب کے
خلاف ہے، کفر و اسلام کا اتحاد قیامت تک ناممکن ہے۔ اور دنیا کا کوئی بڑا
سے بڑا انسان مذہبی تعلیم کی روشنی میں اس کو ثابت نہیں کر سکتا۔ یہ آواز صرف
پبلک پلیٹ فارم کی آواز نہ تھی، بلکہ کچھ خانقاہوں سے بھی اسی قسم کی صدائیں
بلند ہوئیں، سروں، خان بہادروں، رائے بہادروں نے آواز میں آواز
ملائی۔ کتابچے شائع ہونے شروع ہوئے۔ اور مخالفین کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کا
جواب ناممکن ہے۔ لیکن وہ پیکرِ حریت و آزادی آگے بڑھا، اور ہندوستان
کے ۹۰ کروڑ انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ:۔

"ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان۔ ہندوستان کے ۲۲
کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر
ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔"

آپ میں سے اپنے مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ
خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ (حضرت)
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان تھی۔ اس وجودِ مقدس نے عہد نامہ
لکھا۔ بجنسہٖ یہ اس کے الفاظ ہیں کہ

"ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں
صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بنا
چاہتے ہیں، ایک قوم بنا چاہتے ہیں" (خطبہ صدارت آگرہ)

پھر اس سلسلے میں دلائل کا ایک انبار سامنے آیا۔ اس نے مخالفین کو ایک زبردست
شکست دی۔ مگر نوجوانوں میں" آزادی" کے جذبات پرورش پاتے دکھلائی
دیئے۔ یہ بات ہندوستانی روایات کے خلاف تھی۔ اس لئے اس نے کہا
کہ میری ۱۹۱۲ء کی بات کو یاد کرو، اور اس کو اس معرکۂ آزادی میں اصل الاصول
کی حیثیت دے دو۔ میں نے کہا تھا کہ

"ہر طاقت در ہاتھ جس میں تلوار ہو، اپنے مخالف کو شکست
دے سکتا ہے، لیکن تحسین اس فاتح کے لئے ہے جو اسلحہ کے استعمال
کے بغیر حریف کو اپنے قابو میں کرے۔" (الندوہ لکھنؤ اپریل ۱۹۱۲ء)

یہ بات بظاہر بڑی خوش آیند بات تھی مگر جس فصیح انداز میں کہی گئی تھی۔ عوام
اس کے متحمل نہ تھے، مردِ آزاد نے اُن کے چہروں کو پڑھا اور کہنا شروع
کیا کہ:۔

"ہندوستان کی قومیت بحث و نظر کے ابتدائی مدارج طے کر کے عملی زندگی میں گامزن ہو چکی ہے۔ اس لئے قدرتی بات ہے کہ آپ کے ذوقِ عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گذرتی ہو اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی بلکہ عمل کی سادگی ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اور یہ حقیقت بھی تھی رگ عمل کے لئے بے چین تھے۔ پہلا عملی پروگرام "ترکِ موالات" اور ولائتی مال کے بائیکاٹ کے نام سے سامنے آیا۔ مگر ترکِ موالات (نان کوآپریشن) ایک ایسا مسئلہ تھا جو مدبرین زمانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ کیا ترکِ موالات سے ملک آزاد ہو سکتا ہے کیا اس طرح غلامی سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا کسی ملک نے نان کوآپریشن سے نجات حاصل کی ہے؟ بظاہر یہ باتیں ایسی تھیں جو عوام کو متاثر کرنے والی تھیں، حالاں کہ اعتراض کرنے والوں کے دل جانتے تھے۔ اور ان کو اس کے دوررس نتائج کا بھی اندازہ تھا۔ پھر بھی ان زبانوں پر مہر سکوت لگانا ضروری تھا۔ اس لئے معلم آزادی نے صاحبانِ فہم و فراست کی زبان میں فرمایا کہ۔

"قوموں کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں دیکھا جائے جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے۔ بلکہ متفقہ عمل ہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادانہ حقوق کوآپریشن کے ذریعہ نہیں حاصل کر سکتی۔ ہر قوم نے اپنے حقوق جدوجہد کر کے حاصل کئے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور کشمکش ہے۔ کوآپریشن نہیں۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اب مسئلہ کی صحیح صورت نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اور ملک کے ہندو مسلمانوں نے مل کر جدوجہد شروع کر دی۔ عام تعاون (نان کوآپریشن) اور ولائتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شباب پر آئی، برطانوی سامراج کے قدم ڈگمگانے لگے۔ مذہب سے بیگانہ مذہبی ٹھیکیداروں کی تلاش شروع ہو گئی۔ ملک میں کچھ خانقاہیں اور آشرم پہلے سے موجود ہی تھے۔ جو موقعے کے منتظر تھے۔ پہلی سے ایک نیا گل کھلا جس نے سرے سے اس تحریک کو عمل باطل قرار دیا۔ ہندو مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج حائل کرنا اور شدھی، سنگٹھن کے نام سے ملک میں تصادم کرانا اصول قرار پایا جس کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ بہروپئے نئے نئے بہروپ بھرنے لگے اور وہ آزادی کی جنگ جو کامیابی سے ہمکنار ہونے والی تھی، وہ بظاہر رکتی نظر آتی تھی۔ لیکن یہ بات ملک کے لئے اور اہلِ ملک کے لئے بڑی شرمناک بات تھی۔ اس لئے اس نے ہندوستان کے ہر باشندے کو اس کا کیا ہوا عہد یاد دلایا، اور اس عہد کو یاد دلاتے ہوئے کہا کہ:-

"چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک بڑے سے بڑا اعلان کیا، اور دنیا سے کہا کہ ہماری آزادی کا انتظار کرے لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان سننے کے لئے گوش بر آواز ہے، ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامانہ شرمناکی اور اپنے جنونانہ کشت و خون کی اسے ایک نئی کہانی ترتیب دیں۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک اس کی مدافعت اور سنگٹھن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اسی حالت میں

"ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ اور دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں سے حفاظت کرو۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی پکار ہندوستان سے ہو رہی ہے تو غور کر سکتے ہیں کہ بدنصیب ہندوستان کا وطن کب قائم رہ سکتا ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی، انگریزی سامراج کا منشا پورا ہوتے نظر آیا۔ علاحدگی پسندی کے خیالات کی پورے ملک میں اشاعت ہونے لگی مسلمان جن کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم تھی، اور جو تعلیم اور دولت میں ان سے بہت پیچھے تھے، خود کو ٹوٹے اور خسارے میں سمجھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے دریافت کیا کہ کہئے اب کیا راستہ ہے۔ اس نے کہا کہ:-

"کسی قوم کے آزاد ہونے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ آپ کو آزادی کا پورا قدرشناس ثابت کرے۔ جس وقت ہندوستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی، اور عرب کی آزادی محفوظ رہنی چاہئے تو ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ خود آزادی سے محروم نہیں رہ سکتا۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

یہ تو مسلمانوں کے لئے درسِ حقیقت تھا۔ اور ان کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا تھا مگر ساتھ ہی ہندوستان کی ۲۲ کروڑ آبادی سے بھی خطاب

کرتے ہوئے اس مردِ حق بیں کو کہنا پڑا کہ

"میں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی۔ اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہارِ حق سے نہ روک سکا تھا۔ ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ میں ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں، جو ہندو سنگٹھن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔"

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا کہ

"آج یہ تحریک ان لوگوں کو برانگیختہ کرنا چاہتی ہے جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگٹھن کی ضرورت ہے اور نہ مسلم سنگٹھن کی، ہمیں صرف ایک سنگٹھن کی ضرورت ہے اور وہ ہے "انڈین نیشنل کانگریس" ہے۔"

(خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

ابھی یہ کلمات اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ قیامت آگئی،

"مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کا سامان پہلے فراہم کیا جا چکا تھا۔ اب ہندو بھی برگشتہ ہونے شروع ہو گئے۔ مسلمان کو ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کھائے جا رہا تھا، اور ہندو خلافت کی تحریک سے پیدا ہونے والے اثرات سے پریشان تھے۔ ان کو یہ خیال تھا کہ انگریز اگر اس وقت چلا گیا تو ملک کی باگ ڈور پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ بساطِ سیاست کے شاطر کھلاڑیوں نے دو قوموں کے دلوں میں دو الگ الگ قسم کے شبہات پیدا کر دیئے تھے ہندوؤں سے جس حد تک بات کہنی چاہیئے تھی، اس حد تک کہی گئی، رہا مسلمانوں کا سوال تو وہ اس کے ہم قوم تھے، ان سے اس بطلِ حریت اور مجاہدِ جلیل کے تخاطب کا انداز دوسرا تھا۔ ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کوئی نیا نہیں تھا۔ جب اس نے ۱۹۱۲ء میں ملک کی آزادی کے لئے ہندو مسلم یکجہتی بھائی چارہ اور اتحاد کا درس دیا تھا۔ اس وقت بھی ہندو اکثریت کا سوال اس کے سامنے مسلمانوں کی طرف سے رکھا گیا، مگر اس کی نگاہیں ماضی کے آئینہ میں حال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے اس کو کہنا پڑا کہ:-

"میں تو سمجھتا تھا کہ اب یہ بن نکل گیا، مگر آپ تیس برس کا پڑھا سبق ابھی بھولے نہیں، بہترا مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ سیلف گورنمنٹ، ہندو گورنمنٹ ہو جائے گی، ہندو مسلمانوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ پس مسلمانوں کو ہمیشہ غلام اور مملوک بن کر رہنا چاہیئے اگر یہ فلسفہ اب تک باقی ہے تو باقی رہے، تم کو غلامی مرغوب ہے تو ان شاء اللہ خدا ہمیشہ غلام بنا کر رکھے گا۔"

(مضامین ابوالکلام آزاد حصہ دوم، ایک مراسلت کا جواب)

مسلمانوں کو آزادی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ:-

"ہندوستان کو آزاد ہونا ہے وہ آزاد ہو کر رہے گا مورخینِ عالم کی صف ایک نئے مورخ کی راہ تک رہی ہے۔ وہ آزادیٔ ہند کا مورخ ہوگا۔ خلافت کمیٹیاں اگر پوچھتی ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو آزادیٔ ہند کی تاریخ کا پورا مواد صرف اپنے ہی سرمایہ سے فراہم کر دینا چاہیئے۔ تاکہ جب مورخ کا قلم اٹھے تو اُسے اعتراف کرنا پڑے کہ ہندوستان اپنی آزادی کے لئے کسی جماعت کا اس قدر مرہونِ منت نہیں ہے، جس قدر پیروانِ اسلام کا"

(تازہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

اور جس وقت یہ باتیں کہی گئیں اس وقت کچھ حالات بھی ایسے ہی پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے ہندوؤں کا اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لینا قرین قیاس تھا۔ کہ انگریز اگر گیا تو ملک کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ انگریزی سامراج کے ایجنٹوں نے اس شک کو یقین کا درجہ دینے کے لئے مسلمانوں سے مصالحت کی گفتگو شروع کی اور مسلمانوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں مصالحت کی پیش کش کا خیر مقدم کرنا چاہا۔ مگر جس کی نظر بساطِ عالم پر تھی اور جو یہ شبہ اور یہ بات کہنے کے لئے تیاریاں کر رہا تھا اس نے کہا کہ:-

"جس وقت تک ایک چپہ زمین پر، ایک انچ زمین پر اتنے حصہ پر کہ جتنے حصہ میں عراق کے گرد و غبار کا ایک ذرہ آ سکتا ہے، اگر انگریزی حکومت کا بلاواسطہ یا بالواسطہ ہاتھ باقی رہے۔ مسلمان کے لئے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں، پہاڑوں کے غاروں اور جنگلوں میں چلے جائیں وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں" (خطبۂ صدارت جمیعت علماء لاہور ۱۹۲۱ء)

مگر جب یہ مرد باذوق نے دیکھا کہ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو تھوڑی سی تمثیل میں جاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ:

"ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے، اور ہو جانا چاہیے کہ جب تک انگریزی گورنمنٹ، برٹش گورنمنٹ اپنے اس ایلیانہ ظلمنہ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے خلافت شرعی کو پورا نہ کر دے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے۔ جب تک ایشیاء کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا نہ لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے اس وقت تک برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، اس وقت تک اس کے لئے جائز نہیں کہ صلح صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔ وہ تمہارے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے، وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کر لے، بچھوؤں کے ساتھ صلح کر لے، مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا۔" (خطبۂ صدارت جلسہ آگرہ ۱۹۲۱ء)

لیکن جو تخم فساد فرقہ واریت کے نام سے بویا جا چکا تھا۔ اور جس کی آبیاری کے لئے دونوں کے خون بہائے جا چکے تھے۔ اب ایک تناور درخت بنتے ہوئے نظر آیا۔ دوسری طرف ملک کے بعض گوشوں سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ انگریز ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے تیار ہے مگر یہ ہندو مسلم اتحاد کا راگ گانے والے آزادی کی راہ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ آج اگر ہندوستان اس مطالبہ سے دست بردار ہو جائے تو کل اس کو آزادی مل سکتی ہے۔ داعی امن و اتحاد نے بھی ان بھولی بھالی پرفریب باتوں کو سنا، اور پھر اس وقت کے ۲۹ کروڑ ہندوستانی باشندوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹہ کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے۔

تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔" (خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

لیکن بات جو ہونے والی تھی وہ ہو کر رہی، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوا۔ فسادات کی لہریں تیزی کے ساتھ بڑھیں، اور ملک پھر غلام کا غلام رہا، مگر اس کے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے کی جانب نہ مڑ سکے۔ یہاں تک کہ تاریخ نے ۷ برس اور گزار دیئے۔ یہ زمانہ خاموشی کے ساتھ نہ گزارا جا سکا۔ جو ۱۹۲۳ء سے دسمبر ۱۹۲۹ء تک رہی پوری داستان دہرائی گئی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک عدم تعاون، بائیکاٹ کی جنگ، بہادری کے ساتھ لڑی گئی۔ آئینی تبدیلی کے آثار ۱۹۳۵ء سے آنے شروع ہوئے۔ اور اب ہندوستان کے نوڈی سیاست کے ماہرین نے بھی سمجھ لیا کہ حکومت کی چولیں ڈھیلی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس مفکر اعظم کو ایک بار پھر پورے ہندوستان کو مخاطب کرنے کا موقع ملا۔ اور اس نے کہنا شروع کیا کہ

"اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں، ہمارا سفر دور کا تھا۔ اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گزرتے، ہم ہر منزل پر ٹھہرے، مگر رکے کہیں نہیں، ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا، مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں، ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے، مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی، دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک و شبہ ہو، مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا، ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا، ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقت ور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے، نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ ۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے، مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا لیکن آج نظر اٹھایئے اور سامنے کی طرف دیکھئے، نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے بلکہ منزل بھی دور نہیں۔" (خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

مگر جہاں تک اندرونی مسائل کا تھا، تو اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح الجھے ہوئے تھے، سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلمانوں کی علاحدہ پسندی

کا منشا تھا۔ اور مسلمان اپنے کو اقلیت نہیں سمجھنے لگا تھا۔ اقلیت کو جن خدشات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ سارے خدشات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ پہنچے تھے۔ اور ۱۹۴۰ء میں اس کے بعض برخود غلط آقاؤں نے اپنی علاحدہ پسندی کا عام طور پر اعلان بھی کر دیا تھا۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ جس نے ہندوستان کو متحدہ قومیت کا درس دیا ہو، اور جو باہمی اختلاف کو عالم انسانیت کا نقصان سمجھتا ہو، اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی یہی ہوا کہ ان حادثات سے اس کا سکون دل ہل گیا، اور ایک بار حکیمانہ انداز میں پورے ہندوستان کو اکثریت اور اقلیت کی حقیقت سمجھاتے ہوئے مسلمانوں کے دلی خدشات کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا، اور اسی جذبہ کے پیش نظر حکیم ملت، امام الہند نے سب سے پہلے ایک سوال کیا کہ

"کیا ہندوستان میں مسلمان کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے۔ جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟"

لیکن اس سوال کا جواب کون دیتا، جب اس نے دیکھا کہ سب کی زبانوں پر مہر سکوت لگ چکی ہے، جواب دینا درکنار، سوال کے سمجھنے کی بھی صلاحیت نظر نہیں آتی تو وہ خود آگے بڑھا اور کہنا شروع کیا:

"ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں کہی گئی۔ جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمان کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی ہے۔ اور اس لئے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی، دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا، جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہئے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین پر وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے۔ اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں، مگر ابھی تک اس کی جڑیں خشک نہیں ہوئیں۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہئے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تعین کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد کے ساتھ نوعیت کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں، ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے، دوسرے کی دو کروڑ ہے اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا، اور اس لئے دو کروڑ سے کم نہ ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اسی نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔"

(خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

یعنی ہندوستان کے مسلمانوں کو شک کا مریض بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی نعشوں پر کھڑے ہو کر اپنی لیڈری کی عمارت تعمیر کرنے والوں نے اس مردِ حق آگاہ سے عام مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے گانٹھے، اور یہ یقین دلانا شروع کیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے علاحدہ پسندی کی پالیسی صحیح پالیسی ہے، برطانوی سامراج کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے کا اس سے اچھا کیا وقت تھا۔ اس لئے اس نے بھی ۱۹۴۷ء میں انڈیا پلان کا اعلان کیا۔

"انڈیا پلان کی تفصیل ایک طولانی تفصیل ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہوا۔ تقسیم کے بعد جو حالات رونما ہوئے اس کا تصور بھی اندوہ ناک تصور ہے۔ اس وقت یہ یقین تھا کہ

"سوراج ملنے کی تاخیر سے ہندوستان کا نقصان تھا۔ لیکن اتحاد کے رخصت ہو جانے سے عالم انسانیت کا نقصان نظر آرہا ہے۔"

اور یقین نے اعتماد کی شکل ۱۹۴۷ء میں اختیار کر لی تھی اور حال یہ تھا کہ ایک طرف ہندو چیخ رہا تھا کہ ہمارا وجود خطرے میں ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ برطانوی سامراج کے ایجنٹ اس وحشت و بربریت کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان اب سنبھالا نہیں لے سکتا۔ اور یہ یقین اُن کا غلط بھی نہ تھا۔ مگر انھیں کیا خبر تھی کہ ابھی وہ مسیحا موجود ہے کہ جس نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت میں آزادی کی روح پھونکی تھی وہ مسیحا نفسی کا پھر ثبوت دے گا۔

آخر کار یہی ہوا سب سے پہلے ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی کی جامع مسجد میں اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

"انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور انھیں بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔"

پھر یہی بات ایک دوسرا انداز اختیار کر کے سامنے آئی کہ

"یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے، اور یہی وہ انقلاب ہے کہ جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بری شے آگئی۔ یہ واقعہ نہیں وہم ہے حقیقت یہ ہے کہ بری شے چلی گئی اور اچھی شے آگئی۔"

لیکن یہ باتیں ساری تمہیدی باتیں تھیں، اصل سوال اکھڑے ہوئے قدموں کا جمانا تھا اور ان کے دلوں سے اس خوف و ہراس کو نکالنا تھا کہ جس نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا، اس کے لئے فرمایا کہ،

"مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے، اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا، آج انھوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ عیب کی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہے تو اس کو اپنے اس خدا کا جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا کہ 'جو ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم' ہوائیں آتی اور گزر جاتی ہیں اور یہ صرصری ہے لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔"

(امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کا پیغام، تقریر جامع مسجد دہلی ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

پھر دسمبر ۱۹۴۷ء میں یہی باتیں اس سے مختلف انداز میں لکھنؤ میں دہرائی گئیں مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم جمنے لگے، اور دیکھتی آنکھوں نے یہ منظر دیکھنا شروع کر دیا کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں مسلمان موجود ہوں اور آج کسی کو کسی قسم کا کوئی خوف پریشان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اب سوال ملک کی حفاظت اور اس کی ترقی کا تھا، اس پر ہندوستان گامزن ہو چکا ہے۔

"لیکن سفر وہ بھی ایک اخلاص کا اور ایک مقصد کا"

مقصد کے سفر کی ایک کڑی شکتلہ میں پوری ہو جاتی ہے۔ اور دوسری کڑی اس وقت پوری ہوگی جب پوری انسانیت آزاد ہو جائے گی۔

مگر جس کا اندیشہ برسوں سے لگا ہوا تھا وہ وقوع میں آچکا اور ۲۲۔ فروری ۱۹۵۸ء کو شخصی سفر کا خاتمہ ہوگیا اور اس مسافر آخرت نے منزل کو جا لیا، اور دنیا کو کہنا پڑا کہ "حق مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا۔"

آج پورے ملک کے دلوں پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ آج سب کی صورتیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔

لیکن کیا کوئی ہے، جو اس کی زبان سمجھتا ہو، اور اس کا شناسا ہو، یا کسی کو اس کا نام معلوم ہے۔ کیا کسی نے اس کے کاموں کا اندازہ لگایا ہے؟ یہ سوالات بے تکے سوالات ہیں، مگر یہی بات وہی ہے جو اس کی زبان سے، ضطراب کی چیخ بن کر نکلی تھی۔

"[illegible]"

کوئی نہیں، جو میرا آشنا ہو، میں سچ، سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں بے یار و آشنا غریبِ الوطن ہوں"۔

(مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب)

اگر اس کی اس بات کو ہندوستان غلط ثابت کرنا چاہتا ہے، تو پھر اس کا عملی ثبوت پیش کرے اور جس مقصد کو لے کر اس کے شخصی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ اس کو پورا کرے۔ اس کا اہم مقصد ملک کی آزادی کے ساتھ باہمی اتحاد اور فرقہ واریت کا خاتمہ تھا اور آج بھی ہندوستان کی راجدھانی میں کسی اور کی زمین پر نہیں بلکہ اگر دہلی کے قدیم نقشے پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ اپنی زمین پر کھڑے ہو کر وہ یہی پیغام دے رہا ہے۔

"ہماری ساری کامیابیوں کا دار و مدار قدرت پر اعتماد، باہمی اتحاد، اور ڈسپلن پر ہے، اور اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں"









اوپر:- ہندوستان کی عبوری حکومت کے ممبر تعلیمات کی حیثیت سے مولانا آزاد پہلی پریس کانفرنس میں (۳۱ جنوری ۱۹۴۷ء)

درمیان دائیں:- مولانا ابوالکلام آزاد جرمنی کی فیڈرل ری پبلک کے صدر کے ساتھ۔ (جولائی ۱۹۵۵ء)

درمیان بائیں:- مولانا آزاد آثارِ قدیمہ کے مرکزی مشاورتی بورڈ کے چھٹے اجلاس میں تقریر فرما رہے ہیں۔

نیچے:- مولانا آزاد [illegible]





آزاد [illegible] [illegible]



ں:- مولانا آزاد مشرق قریب اور یورپی ممالک کے خیر سگالی
دورے پر روانگی کے وقت۔ 18.5.1951

ب:- مولانا آزاد دلی کے پالم ہوائی اڈے پر شاہ سعود کے ساتھ 27/11/1955

مولانا آزاد استنبول میں۔

مولانا آزاد کشمیر کے مقام ڈاچی گام میں (بشکریہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)





خواجہ احمد فاروقی

مردِ آزاد

دہلی، کے ڈیلی لین

۲۲۔ فروری ۱۹۵۸ء

صدیقی۔ کیا لکھوں، حقیقت یہ ہے کہ اب کچھ لکھنے کو نہیں ہے وہ منحوس گھڑی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، بالآخر آ پہنچی اور حضرت مولانا آزاد کے وجیہ ساری قوم کو سوگوار چھوڑ کر اپنے آقا سے جا ملے۔ رنج، صدمہ، اس قسم کے سارے الفاظ کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ اور دیدہ و دل کی اُس حالت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو صبح سے اس وقت تک آن پہ گزر چکی ہے۔ کل پرسشِ حال کے لئے دیدولت پر حاضر ہوا تھا۔ مجمع سا مجمع تھا۔ اجمل خاں صاحب ٹیلیفون لئے بیٹھے تھے۔ بلا مبالغہ ہر منٹ پر گھنٹی بجتی تھی اور یہی سوال ہوتا تھا:

"اب حضرت کا مزاج کیسا ہے؟"

جواب ملتا، "وہی حال ہے۔ کوئی افاقہ نہیں۔ دعا فرمائیے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، گھنٹی جلد جلد بجنے لگی اور سوال و جواب مختصر ہوتے ہوتے بس یہ رہ گئے:

"حضرت کا مزاج؟"

"وہی، بدستور" —— پھر خاموشی چھا گئی۔ اتھاہ خاموشی۔ لاکھوں آدمیوں کا ٹھٹ مگر سانس تک کی آواز نہ تھی۔ ہر شخص کا رُخ ۴ کنگ ایڈورڈ روڈ کی طرف تھا۔ سارا شہر اُمڈ پڑا تھا۔ مضافات کے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ میرٹھ اور علی گڑھ تو خیر دلّی کی انگنائی ہیں وہاں سے عقیدت مندوں کا آنا تعجب خیز [illegible] مدراس، بھوپال، بمبئی، حیدرآباد، کلکتہ، جے پور، سری نگر تک سے [illegible] آ گئے تھے۔ تا حدِ نظر آدمی ہی آدمی تھے۔ ہر شخص مغموم، ہر آدمی رنجیدہ۔

میرا جی چاہتا تھا کہ حضرت کو مہندیوں میں دفن کیا جاتا جہاں چند ایسے بزرگوں کی آرام گاہ ہے جن کا زمانہ میں جواب نہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ عبدالرحیمؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ محمد اسحاقؒ لیکن فیصلہ ہوا کہ لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کے میدان میں دفن کیا جائے۔ سب سے الگ۔ خاص الخاص جگہ — یہ فیصلہ سب سے ہی مناسب ہے اس لئے کہ مولانا منفرد لوگوں میں سے تھے۔ با ہمہ و بے ہمہ۔ فکر و نظر کی عام راہوں میں وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہی رہا۔ زندگی بھی لائقِ رشک اور موت بھی لائقِ رشک،

شدیم خاک ولیکن بوئے تربتِ ما
توان شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

اُن کی زندگی، وفاداری و استواری کا کامل نمونہ ہے۔ پرافشانیٔ زر کی عجیب و غریب مثال۔ اُن کا مقصد بلند تھا، اس لئے وفا کا درجہ بھی بلند تھا۔ اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جیسے قطب نما کی سوئی قبلہ کی سمت ہوا کرتی ہے۔ اس لئے میں کس کس طرح کی ذلتیں برداشت کیں، کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں، کیا کیا سختیاں جھیلیں، نہ پوچھئے

گرد ناک ہے اب تک بھی جیب بالوں کی

وہ واقعی بے پناہ تھے۔ قطرہ کو گہر بننے تک بہت سی منزلیں طے کرنا پڑتی

اگست ۱۹۵۸ء

آج کل دہلی، ابوالکلام نمبر

ہیں، "ان کا کوئی جانشین ہے۔ وہ اس قبولیت کے ساتھ گھر اندر میں داخل ہوئے کو سرو و شمشاد خرامگے"۔ وہ جہاں ہیں اتنہا ہیں۔

مولانا کی عظمت میں شبہ نہیں۔ لیکن جو چیز مجھے سامنے کر یاد آتی ہے وہ ان کی شخصیت کا حسنِ تناسب اور اس کی دل کش ہمواری ہے۔ بعض لوگوں کے یہاں بڑی افراط و تفریط ہوتی ہے۔ آن جہانی تصور میں گم ہوئے تو پھر کسی بات کی خبر نہیں۔ اور دنیا کی طرف توجہ کی تو بس اُسی کے ہو گئے۔ Pascal کو حیرت تھی کہ لوگ عاقبت سے بے خبر ہو کر کیسے شاہد و خمریات و رامش و رنگ میں محو ہو جاتے ہیں۔ (They) Dance and Play the Lute and Sing and Make Verses

ڈی ایچ لارنس کہتا ہے لوگوں کو گرد و پیش کی مسرتوں اور مشکلوں سے آخر کس طرح فرصت مل جاتی ہے کہ وہ ماورائی مسائل پر وقت ضائع کر سکیں لیکن مولانا کے وسیع تخیل میں ان دونوں کے لئے گنجائش تھی اور بڑے صحیح تناسب کے ساتھ انھوں نے اسلام اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں لینا چاہیئے تھا۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے انسانیت اور رواداری میں دونوں کی ایک مشترک اساس بھی تلاش کر لی تھی۔ ایک مرتبہ "انسانم آرزوست" کے سلسلہ میں ایک چینی مقولہ پیش کرنے لگے کہ اگر تمہیں ایک سال کا انتظام کرنا ہے تو گیہوں بوؤ، اگر دس سال کا، تو درخت بوؤ اور اگر نسلوں کا بندوبست کرنا ہے تو انسان بوؤ۔ ان کے یہاں سارا زور انسان اور انسانیت ہی پر ہے۔ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی پر ہے۔ لیکن اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنے اعجازِ عمل سے تاریخ کی تخلیقی رَو کو موڑ دیا اور ہمیں وہ قدریں دیں جن کی روشنی میں چل کر ہم حیات کے مراتبِ عالیہ پر فائز ہو سکتے ہیں۔

گویند پس از ہزار سال از عالم — روشن جانے ز آسمان زیر آید
خاقانی از آں جنس درین دہر بود — پردہ نشیں کہ کارواں دیر آید

آپ کا
خواجہ احمد فاروقی

حاصلِ گذارش

"...ہم کو اپنے سفر میں نکلے ہوئے دو سال ہو گئے۔ ہمارا سفر تاریکی میں نہ تھا بلکہ دوپہر کی روشنی میں تھا اور دنیا اُسے دیکھ رہی تھی۔ ہم اگر حرکت میں رہے ہیں تو اس پر پردہ نہیں پڑا ہے اور اگر جمود و غفلت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہیں تو وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔ اگر اپنے سفر کا کچھ حصہ طے کر سکے ہیں تو دیکھنے والے اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ اور اگر راہ کی دشواریوں سے وا ماندہ رہ گئے ہیں تو ہمت کا تولنگ اور قدم کی لغزش بھی بہرحال نادر ہے۔ متاع بالکل نئی تھی اور اپنے سفر کے لئے خود ہی ایک نئی راہ نکالی گئی تھی۔ نہ تو ہمارے سامنے نمونہ تھا اور نہ کوئی رہنمائی کی مادی روشنی —— ۔

لب خشک رفت و دامنِ پرہیز تر نہ کرد — زاں چشمہ کہ خضر و سکندر وضو کنند

قوموں اور جماعتوں میں انقلاب و تغیر کی دعوتوں کے نفاذ کا کام ایک ایسا دشوار گذار سفر ہے کہ اگر قوموں کی بادیہ پیمائی اور تگ و دو کے لیے سلامتی کا ایک قدم بھی طے ہو جاتا ہے تو اس کی کامیابی رشک انگیز اور اُس کی فتح مندی جشن و نشاط کی مستحق ہوتی ہے۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کو گرا کر نئی دیوار کے بنانے کے لئے کس قدر سامان اور وقت مطلوب ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کے لئے تو وقت کا کوئی سوال ہی نہ ہونا چاہیئے جو معتقدات و اعمال کی ایک پوری آبادی کو بدل دینا چاہتے ہوں۔ اور صرف کسی دیوار اور محراب ہی کو نہیں بلکہ شہر کی تمام عمارتوں کو از سرِ نو بنانے کے آرزو مند ہوں . . . ."

(الہلال، جون ۱۹۱۴ء)

اعجاز صدیقی

تیرے بعد!

بہ یادِ ابوالکلام آزادؒ

تھا جو سلسلۂ لطف و عنایت تجھ سے
تلخیوں کو بھی ملا رنگِ حلاوت تجھ سے
کسی دلدار سے کی جب بھی شکایت تجھ سے
مل گئی چہرۂ افسردہ کو رنگت تجھ سے
پائی اک لذّتِ بے حرف و حکایت تجھ سے
اسے کہ باقی تھی تب و تابِ محبت تجھ سے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا "تیرے بعد"

وضعداری وہ تری، وہ تری گفتار کا ڈھنگ
وہ خموشی تری اور وہ لبِ اظہار کا ڈھنگ
بانکپن وہ تری، وہ تری رفتار کا ڈھنگ
خلوتِ شب میں وہ تیرے دلِ بیدار کا ڈھنگ
صبح کے گیت میں وہ فکرِ فسوں کار کا ڈھنگ
"چائے" کی بھاپ سے اُٹھتے ہوئے اسرار کا ڈھنگ
ہوئی معتوب ہر انداز و ادا "تیرے بعد"

جیسے یکبارگی خضرِ رہِ منزل کھو جائے
کوئی زحمت کشِ ہر جادۂ مشکل کھو جائے
جیسے محفل ہو، مگر صاحبِ محفل کھو جائے
بھیڑ میں جلوؤں کی تابِ نگہ و دل کھو جائے
شبِ تاریک میں جیسے مہِ کامل کھو جائے
سخت طوفان ہو اور دامنِ ساحل کھو جائے
راستہ بھول گئے راہنما تیرے بعد

موم ہو کر تری مٹھی میں رہا آہنِ وقت
ایک تھی، گردنِ مینا ہو کہ ہو گردنِ وقت
مستیِ راہبراں جب بھی بنی رہزنِ وقت
ہوشیاری سے سنبھالا تری اک توسنِ وقت
تو کہ تھامے کرۂ وقت میں تر دامنِ وقت
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن" وقت
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا "تیرے بعد"

تیرے خاموش تدبّر کے اشارات کہاں
سب میں وہ قوّتِ تجزیۂ حالات کہاں
تھا یہ معلوم تجھی کو کہ گھنی رات کہاں
دن کے اُجیاروں سے کھا جاتی ہے خود مات کہاں
ختم ہو سکتی ہے ہر شورشِ آفات کہاں
بن کے خورشید چمک سکتے ہیں ذرّات کہاں
سرد آتش کدۂ فکر ہوا تیرے بعد

گو ترے طرزِ تکلم کا وہ جادو نہ رہا
نگراں اب وہ ترا دیدۂ پُر سو نہ رہا
نفسِ گرم سے پھیلائے جو خوشبو نہ رہا
پھول بن جانے کے قابل کوئی آنسو نہ رہا
دل کی تسکین کا باقی کوئی پہلو نہ رہا
وہی ہنگامۂ محفل ہے مگر تُو نہ رہا
"بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا" تیرے بعد

ہیں غلط سمت خیالات کے دھارے اب بھی
ضد پہ ہیں، بگڑے روایات کے مارے اب بھی
ہیں پسِ پردۂ انفاس شرارے اب بھی
آندھیاں دیتی ہیں شعلوں کو سہارے اب بھی
شر پہ آمادہ ہیں کچھ لوگ ہمارے اب بھی
ہیں وہی برقِ سیاست کے نظارے اب بھی
"کس کے تھم جائے گا سیلابِ بلا" تیرے بعد

لوگ کہتے تھے ترا خلق تھا راز جن میں
اور تو نے ہی دیا شعلۂ آواز جنھیں
سوز دیتی رہی تیری نغمہ ناز جنھیں
تو نے بخشی تھی نئی قوتِ پرواز جنھیں
وہ کہ تھا ہوشِ رُبا تیرا ہر انداز جنھیں
تھا ترے رنگِ طبیعت سے بڑا ساز جنھیں
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا" تیرے بعد

یوں تو دیکھے گئے شامل ترے ماتم میں سبھی
چند دن کا تھا مگر مشغلۂ جامہ دری
اب نہ وہ آہوں کی شدت ہے، نہ وہ نوحہ گری
قوم نے ہائے تری موت کی وہ قدر نہ کی!
تیرے اخلاص کی، دیے کی طرح داد نہ دی
"غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی"
"کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا" تیرے بعد

حل کیا وقت کا پیچیدہ سے پیچیدہ سوال
حدِ امکاں کے قریب آ گیا ہر امرِ محال
فیصلوں کو ترے ٹھکرائے، یہ تھی کس کی مجال
سب نے تجویزوں کو مانا تری بے قیل و قال
اللہ اللہ تری فکر کا وہ اوج و کمال
جنھیں گمراہیِ منزل سے ہو نیچے کا خیال
چُوم لیں وہ ترا نقشِ کفِ پا تیرے بعد

ہمہ دانوں میں مسلّم ہمہ دانی تیری
بھول سکتا نہیں دل، سحر بیانی تیری
لے کہ تحریر ہر اک گنجِ معانی تیری
اے کہ تصنیف نہیں کوئی بھی فانی تیری
بے نشانی سے بھی پیدا ہے نشانی تیری
وقت دہرائے گا تا حشر کہانی تیری
تذکرہ ہوگا بہر حال ترا تیرے بعد

تیرا کردار مثالی وطنیت کے لئے!
تو نے نفرت کے بجے وار، محبت کے لئے!
تو شریعت کے لئے تھا کہ امامت کے لئے!
تو قیادت کے لئے تھا کہ سیاست کے لئے!
یہ سمجھنا ہے کٹھن چشمِ حقیقت کے لئے!
تیرا ہونا تھا، کسی سخت ضرورت کے لئے!
رازِ قوم اور وطن پہ یہ کھلا تیرے بعد

یہ وطن، تیرا وطن، میرا وطن، سب کا وطن
یہ چمن، تیرا چمن، میرا چمن، سب کا چمن
یہ ہمالہ کی زمیں، رقصِ گہِ گنگ و جمن
منبعِ علم و ادب، مرکزِ تہذیب و فن
جس میں پیوست تری فکرِ رسا سوزِ سخن
ٹوٹنے والا ہے تارِ دل کو سب پیراہن
پوچھ مجھ سے۔ کہ یہ ہو جائے گا کیا، تیرے بعد!

ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا آزاد کی شخصیت

"آثارِ ابوالکلام آزاد" کی روشنی میں

مولانا آزاد کی شخصیت جتنی عظیم تھی اُس اعتبار سے اُن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جتنا لکھا گیا ہے اُس میں بھی اکثر کے بارے میں یہ کہنا دشوار ہے کہ اُس نے اُن کی عظمت کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ انگریزی میں مہادیو ڈیسائی کی کتاب اور اُردو میں قاضی عبدالغفار کی "آثارِ ابوالکلام آزاد" شاید اس وقت تک اس معیار پر سب سے زیادہ پوری اُترتی ہیں۔ قاضی عبدالغفار سے اُردو ادب کے طالب علم بحیثیت ایک انشاپرداز، صحافی، طنز نگار اور سوانح نویس کے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور حیثیتوں سے قطعِ نظر سوانح نگار کی حیثیت سے "آثارِ جمال الدین افغانی" کی ترتیب کے بعد اُن کا پایہ ہمارے سوانحی ادب میں خاصہ بلند تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انھیں دوسروں کے مقابلے میں مولانا آزاد سے قرب بھی زیادہ حاصل رہا اور اس لئے اُن کی نظر حضرت مولانا کے ذہن کے پوشیدہ گوشوں تک زیادہ پہنچ سکی۔ آج کی صحبت میں یہ دیکھنا ہے کہ قاضی عبدالغفار اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں کہ ہمیں ان پوشیدہ گوشوں کی جھلکیاں دکھا سکیں اور حضرت مولانا کی عظمت کے ساتھ انصاف کر سکیں۔

قاضی عبدالغفار نے شروع ہی میں یہ اعتراف کیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل کام ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ غلط اندازہ کرنے کے اندیشے کو دل سے نکال دیا جائے۔ وہ خود یہ اندیشہ اپنے دل سے دُور نہیں کر سکے ہیں۔ وہ مولانا آزاد کو ایک "بہت مشکل انسان" سمجھتے ہیں اور ان اعترافات کے بعد اپنے کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس سے یہ تو فائدہ ہوتا ہے کہ اُن کا قاری اُن سے مولانا کی شخصیت کے بارے میں عجائب و لطائف سُننے کا متوقع نہیں رہتا لیکن یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ خود اُن کے ذہن میں تردّد اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے جس کا اثر اُن کے کام پر بھی پڑتا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی شخصیت کے جس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ اُن کی "انفرادیت" ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:- "جب میں نے یہ مطالعہ شروع کیا تو میرے اس تبصرے کا موضوع نہ تو مولانا کی شخصی زندگی کے معمولات تھے، نہ اُن کی خاندانی یا ذاتی عظمت تھی نہ اُن کی سیاسی زندگی کے کارنامے تھے۔ نہ اُن کا مجتہدانہ علم و فضل تھا۔ بلکہ میری فکر و نظر کا مرکز صرف اُن کی مخصوص "انفرادیت" تھی جس کے نقش و نگار اُن کی تحریروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔" مولانا کی اس "انفرادیت" میں سب سے زیادہ حصّہ اُن کی محیّر العقول "جینیس" کا ہے جس کے بارے میں قاضی عبدالغفار کی رائے ہے "جب مولانا دُنیا کے سامنے آئے تو وہ اپنے ساتھ علم و فضل اور تقدّس کی روایات ہی نہیں لائے بلکہ ایک طاقت ور "جینیس" کی بے پناہ قوتِ اجتہاد بھی لے کر آئے جس نے انھیں آباؤ اجداد کے حلقۂ افکار کے باہر بہت سی نئی راہیں دکھائیں اور دُنیا کو ایک ایسی زبردست "انفرادیت" سے آشنا کیا جیسی کہ صدیوں سے اس ملک میں پیدا نہ ہوئی تھی۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی "جینیس" نے اُن کی "انفرادیت" کو جنم دیا اور اُن کی انفرادیت نے ایک طرف اُن کی شخصیت

میں وہ حسن اور عظمت پیدا کر دی جس کی اس ملک کی حالیہ تاریخ میں سوائے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے کوئی دوسری مثال نہیں ملتی اور دوسری طرف اُن کے قلم سے ایسے جواہر ریزے نکلوائے جنھوں نے اُردو زبان کو امر کر دیا۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی "انفرادیت" کو اُن کے ادب میں جا بجا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں اُس کا سراغ پایا ہے۔ بڑے ماہرانہ انداز میں نقاب کشائی کی ہے۔ مولانا سب سے زیادہ "غبارِ خاطر" میں کھل کھیلے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ یہ خطوط اشاعت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ ان کا مقصد خود اپنی طبیعت کا بار ہلکا کرنا اور اپنے "حبیبِ لبیب" اور "صدیقِ مکرم" سے "ہم کلامی" اور "مخاطبت" کی خوش وقتی حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے بھی مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد "غبارِ خاطر" ہی سے لی ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولانا کی انفرادیت نے اُن کی شخصیت میں بڑا حسن اور عظمت پیدا کر دی لیکن اس میں بھی کچھ شبہ نہیں ہے کہ اسی "انفرادیت" ہی کی بدولت اُن کے اور عوام کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی جو ایک سیاسی کارکن اور قومی رہ نما کے منصب سے میل نہیں کھاتی اور جس نے انھیں ہندوستان کی عوامی زندگی میں گاندھی اور جواہر لال یا محمد علی اور عبدالغفار خاں نہیں بننے دیا۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:- "اُن کی انفرادیت عوام کی نفسیاتی سطح سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی عامی اُسے عام پیمانے سے ناپ تول نہیں سکتا.... مولانا کی یہ نفسیاتی کیفیت، جس کا خود انھوں نے "غبارِ خاطر" کے مکتوبات میں بہت بلیغ اشاروں کے اندر ذکر فرمایا ہے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان ایک اُونچی دیوار بن گئی ہے۔" کون جانتا ہے کہ اگر یہ "اُونچی دیوار" نہ بن گئی ہوتی تو آج ہندوستان، خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کس طرح مرتب ہوئی ہوتی۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی اس "انفرادیت" اور "تنہائی پسندی" کی توجیہ "غمگیں احساس" سے کی ہے۔ اس معاملے میں انھیں مولانا کے شریکِ حال حکیم اجمل خاں (جن کے بارے میں قاضی صاحب کی تصنیف "حیاتِ اجمل" شائع ہو چکی ہے) نظر آتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ انھیں حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت کے مطالعہ کا کافی موقع ملا تھا۔ اور اس لئے انھوں نے "ایک ایسی معنوی کیفیت کو پہچاننے کے کچھ اشارے پائے تھے: لیکن وہ مولانا کے اس حد قریب کبھی نہیں پہنچ سکے اور اسی لئے اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش کرنا ضروری ہو گیا۔ غالباً اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں کی شخصیت اتنی 'مشکل' نہیں تھی جتنی مولانا آزاد کی تھی۔"

اس مرحلے پر قاضی عبدالغفار مولانا آزاد کی فطرت کے "غمگین احساس" پر مزید روشنی ڈالنے سے قاصر رہتے ہیں، وہ ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ آخر اس "غمگینی" کا اصلی سبب کیا ہے۔ صرف "فطرت کا کمال" ہی تو اس کا واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی "آثار" کے مطالعہ سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح مولانا آزاد کی شخصیت عجوبۂ روزگار تھی۔ اسی طرح اُن کی شخصی اور سیاسی زندگی کے واردات اپنے اندر چشم بینا کے لئے بڑا سرمایۂ عبرت رکھتے ہیں۔ اُن کی پیدائش ایک خالص مشرقی بلکہ مولویانہ گھرانے میں ہوتی ہے۔ انھیں تعلیم وہ ملتی ہے جو سوائے تنگ نظری اور خود بینی کے دوسرا کوئی سبق نہیں پڑھا سکتی۔ چوں کہ وہ مشائخ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اُن کے گرد عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کا ایسا ہجوم رہتا ہے جو اُن کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتا ہے اور اُن کی طرف پیٹھ کر کے چلنا عذابِ الٰہی کا مستوجب سمجھتا ہے۔ ان حالات اور ایسے ماحول میں اُنھیں جو کچھ بننا چاہئے تھا اُس کے بالکل برعکس وہ زندگی کے ابتدائی دَور ہی سے وسیع النظری اور خدمتِ خلق کے مسلک کو اپناتے ہیں اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر استخلاصِ وطن کی تحریک میں تن من سے شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں انھیں ایک اور ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں برادرانِ وطن تو بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے ہیں لیکن مسلمان من حیثیت القوم اُس سے الگ ہیں اور سرسیّد اور اُن کے جانشینوں کے بتائے ہوئے راستے ہی پر چلنا باعثِ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ قلم کو خونِ دل میں ڈبو کر اُس سے مسلمانوں کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ اور جس انداز سے لکھتے ہیں۔ اُس سے ایک طرف تو عام مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن دوسری طرف بوڑھے رہنماؤں کی پیشانیاں بھی شکن آلود ہو جاتی ہیں اور غیر ملکی حکومت کے اشارے پر اُن کے خلاف بہتان تراشی اور الزام آفرینی کا طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ اُس کی ذرا پروا نہیں کرتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں، اُن کے لئے وہ وقت البتہ بہت سخت ہوتا ہے جب اس ملک میں بسنے والے دو بڑے فرقے ہندو اور مسلمان، اپنی سادہ لوحی کے سبب خود غرض رہنماؤں اور غیر ملکی حکمرانوں

کمانڈرکا رین کر باہم دگریبت و گریباں ہوجاتے ہیں اور ملک کی آزادی اور اتحاد کا جو نقشہ انھوں نے اپنے ذوقِ عمل اور رجحانِ کردار سے بنایا تھا وہ بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی پر بس نہیں ہوتی بلکہ ملک کے فرقہ پرست عناصر ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے "مسیحاِ اعظم" کے دلوں میں اُن کے خلاف بے سروپا شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ وہ لوگ جن کی خدمت اور رہنمائی کی خاطر انھوں نے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کی تھیں اور قسم قسم کے الزامات اٹھائے تھے اُن سے واقعی بدظن ہو جاتے ہیں اور اُن کے ہر قول اور ہر فعل کو شُبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُن کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اُن کی شان میں کسی گستاخی اور بدزبانی سے باز نہیں آتے۔ اس کے جواب میں وہ یہ تو نہیں کرتے کہ اپنے مخالفوں پر کیچڑ اچھالیں اور اُن کی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دیں اس لئے کہ یہ اُن کی شانِ استغنا اور شخصی عظمت کے منافی ہے لیکن یہ ضرور کرتے ہیں کہ ایک گنبد کے اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے (اور اگر ہے تو کوئی چور دروازہ ہے!) اپنے وجودِ معنوی کو بند کر لیتے ہیں اور دنیا والوں کی نظروں سے اتنے دُور ہو جاتے ہیں کہ اُن کے لئے سوا اس کے چارہ کار نہیں رہتا کہ "اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش" کرنے کی کوشش کریں! ظاہر ہے کہ اس کا اثر مولانا کی تحریروں پر بھی پڑتا ہے اور اُن کی فطرت کا "غمگین احساس" جسے اُن کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے طرزِ عمل سے بہت تقویت پہنچتی ہے۔ اُن کے ادب میں ایک ایسی انفرادیت اور گداز پیدا کر دیتا ہے جس کا دوسرے ادیبوں کے ہاں سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" کے اوراق میں اپنے آرٹ کے بنیادی عناصر کی نشان دہی فرما دی ہے۔ وہ "انانیتی ادب" کی اصطلاح میں اپنے ادب کی فطرت کو نام زد فرماتے ہیں۔ مولانا نے "انانیتی ادب" کے سلسلے میں دنیا کے مختلف نامور ادیبوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس فہرست میں خود مولانا کا نام بھی کافی اونچے مقام پر جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اور اردو ادب میں تو بقول "قاضی عبدالغفار" کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں"۔ مغربی زبانوں کے "انانیتی ادب" کو سمجھنے میں بھی ہمیں سب سے زیادہ مدد مولانا ہی کی تحریروں سے ملتی ہے۔ جیسا کہ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ "انانیتی ادب"

کے اخص الخواص ایسے افراد ہوتے ہیں جن کا ادب عام تعداد میں تو لاٹھیں جاسکتا اور جن کو ادب و تصنیف کے عام کُلیات پکڑا نہیں سکتے . . . . اس اشارے کو مولانا کا ادب سامنے رکھ کر سمجھ لینا کچھ ایسا دشوار تو نہیں ہے" مولانا کے ادب کی اس شاخ کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں جس شخصیت کا نقش اُبھرتا ہے اُس کے سب سے نمایاں اجزاے ترکیبی قاضی عبدالغفار کے الفاظ میں "خودداری، انانیت، انفرادیت، کم آمیزی اور احساسِ برتری" ہیں۔ "جو عقلیت اور Intellect کا ایک طبقاتی امتیاز ہے۔"

یہ "خودداری اور کم آمیزی" مولانا کی شخصیت میں جو جادو جگا دیتی ہے اُس کی طرف مضمون کے شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس "خودداری اور کم آمیزی" کی بدولت ہم نے کھویا کیا اور پایا کیا؟ اس میں شُبہ نہیں ہے کہ ہمیں ایک اوّل درجے کی "جینیس" میسّر آگئی، خود مولانا کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ عوام کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی زد سے بہت دُور نکل گئے۔" لیکن ساتھ ہی ہم نے ایک ایسا عظیم سیاسی رہنما کھو دیا جو اگر اس درجہ "خوددار اور کم آمیز" نہ ہوتا تو اُس کا مقام کسی طرح گاندھی جی سے کم نہ ہوتا۔ افسوس ہے کہ مسئلے کے اس پہلو سے قاضی عبدالغفار نے بحث نہیں کی ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت کے نمایاں ہونے کا ایک اور موقع بھی یاد آتا ہے اور وہ ہے اُن کے مخالفوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا کے مخالفوں نے انھیں عوام کی نظر سے گرانے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے اور طرح طرح کے نام دھرے۔ لیکن مولانا نے کبھی اپنی زبان یا قلم کو اُن کی مخالفت سے آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ اُن کے اعتراضات اور الزامات کا جواب دینا بھی اپنے لئے کسرِ شان ہی سمجھا۔ اس ملک کی سیاسی زندگی کی عام اخلاقی سطح کو بلند کرنے میں مولانا نے جتنا بڑا کام کیا ہے اُس میں اُن کے ساتھ دوسرا نام گاندھی جی ہی کا لیا جا سکتا ہے۔ اس عارفانہ یک سوئی کے مظاہرے میں اُن کی انفرادیت اُن کے بہت کام آئی۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں "رائے اور خیالات کو وہ ایسی بلندی سے دیکھتے رہے اور عام مباحث میں اُلجھنے کو انھوں نے اپنے شخصی وقار کے اس قدر منافی سمجھا کہ ایسے مسائل میں افکار اور تصورات کا ضبط ایک سنجیدہ خاموشی اُن کے علم و فضل کی ایک ضروری شرط قرار پائی۔" مولانا آزاد کی طرح قاضی عبدالغفار بھی انفرادیت کے بہت

بڑے سخت دشمن ہیں اور اس لئے جہاں کہیں اُن کا قلم مولانا کے مسلم فرقہ پرستوں سے تصادم کی نقش آرائی کرتا ہے وہاں اُس میں بڑی جان آجاتی ہے اور وہ بہت دل فریب گل بوٹے کھلانے لگ جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "مولانا کی شخصی اور معنوی عزم واستقامت کا امتحان حکومت کے جبر واستبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا کہ وہ آزمائش تھی جس میں مولانا اُس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا، وہ تیر ایک دفعہ چل چکا، ہو گئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ وارانہ تعصبات کی آگ روشن کر دی..... بہت سے بلند آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے نہ اُتر سکے، لیکن مولانا خود اپنی "قوم" کے ہاتھوں (جب وہ گمراہ ہو چکی تھی) سب کچھ جھیل گئے۔ برطانوی حکومت کا فولادی پنجہ اُن کے وجود معنوی کو اس قدر مجروح کبھی نہ کر سکا۔ جتنے زخم خود اُن کی گمراہ "قوم" نے اُن کے دل و دماغ پر لگائے۔ مگر انھوں نے ان تمام جراحتوں کو شکوہ شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر لائے بغیر گوارا کر لیا.... ...مولانا کی اس استقامت میں بہت کچھ دخل اُن کی نفسیاتی کیفیت کو بھی تھا۔ اپنی نفسیاتی خلوت میں انھوں نے اپنے سے کم درجے کی مخلوق سے شکوہ شکایت کرنے کی ادنیٰ سطح پر جانا اپنے ذہنی مقام کی توہین سمجھا...... اُس احساسِ خودی اور علم وفضل کی اُس انانیت نے جو مولانا کے کردار کی بنیاد ہے اُن کو ہمیشہ راہ و رسمِ عام سے علاحدہ رکھا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی ایک پُرتمکین (رفیعور) خاموشی تنِ تنہا اُن یورشوں کا مقابلہ کر سکی جو سال ہا سال ہر قدم پر اُن کا راستہ روکتی تھیں..... مولانا ہمیشہ سب سے زیادہ اُن حملوں کی زد پر رہے جو "لیگ" سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں پر کئے جاتے تھے.... جب کانگریس کی تحریکِ آزادی کے دوران میں خدا اور رسول کے نام لے کر مسلم لیگ کے نظریات کو جاہل مسلمانوں کے دلوں میں بٹھایا گیا اور ایک خود غرض اور ناعاقبت اندیش قیادت نے جہلاء کے جذبات کو اتنا گرم کر دیا کہ عقل وفہم کے تمام راستے بند ہو گئے تو اُس زمانے میں مولانا کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔ "قائد اعظم" نے انھیں "شو بوائے" کا خطاب عطا فرمایا.... جتنی گالیاں انھیں دی گئیں شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے لیڈر کے حصے میں آئی ہوں ... اور یہ سب ایک ایسا امتحان تھا جس سے مولانا اپنی پیشانی پر ایک شکن ڈالے بغیر گزر گئے۔" اس سلسلہ میں میں نے اتنے طویل اقتباسات اس لئے دیئے ہیں کہ قاضی عبدالغفار کی طرح میرا بھی یہ خیال ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور اُس کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے

سب سے اہم اُن کی زندگی کے اُسی پہلو کا مطالعہ ہے، جہاں اُن کا تصادم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست سے ہوا۔ غیروں کے ہاتھ سے تلوار کے زخم کھا کر بھی دل و دماغ کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو اپنوں کی زبان سے نکلا ہوا ایک تلخ لفظ کر دیتا ہے۔ آدمی جب یہ سمجھے کہ ہم جن کی بھلائی کے لئے کام کر رہے ہیں وہی ہماری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اُن کے بھڑکانے والے وہ لوگ ہیں جن کی ساری زندگی اوّل تو غیر ملکی حکومت کی کاسہ لیسی میں گزری ہے ورنہ کم از کم ذاتی عافیت کوشی کی خاطر قومی زندگی کی ہر ہمی اور نشیب و فراز سے تو ضرور ہی کنارہ کش رہے ہیں تو دل و دماغ پر جو بھی نہ گزر جائے کم ہے لیکن ان حالات میں بھی ایک طرف خدمتِ خلق میں بدستور مصروف رہنا اور دوسری طرف اپنے زبان وقلم کو مخالفت کی آلودگی سے ملوث نہ ہونے دینا اتنا بڑا کام ہے جس کی مثالیں تاریخ میں ڈھونڈنے سے دو چار ہی مل سکتی ہیں اور یہ کام کوئی ایسا شخص ہی انجام دے سکتا ہے جس کی انفرادیت نے اُسے عام سطح سے بہت بلند بالا مقام پر متمکن کر دیا ہو۔

زندگی کے سفر میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور قسم قسم کے نشیب و فراز آتے ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی جتنی اعلیٰ اور بامقصد ہوتی ہے، اتنی ہی اُس کی راہ میں رکاوٹیں بھی زیادہ آتی ہیں۔ ان رکاوٹوں سے کامران گزرنے کے لئے انسان کو جو جدوجہد کرنی پڑتی ہے وہ اُس کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر کو اُجاگر کر دیتی ہے جنھیں "تضاد" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن زندگی کا یہ تضاد اُس میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور کشش پیدا کر دیتا ہے اور اسے ایک ایسا "انسانی رنگ" Human Touch دے دیتا ہے۔ جس سے وہ بصورتِ دیگر محروم ہی رہتا۔ مولانا آزاد نے "غبارِ خاطر" کا ایک خط میں اورنگ زیب کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ یہ "وہ پتھر کا انسان" جب ایک حسین اور بے باک لڑکی سے متصادم ہوا تو اُس کا اس درجہ اثر قبول کیا کہ اُس کے ہاتھوں اپنی سب سے عزیز متاع یعنی دین وایمان فروخت کرنے کو تیار ہو گیا۔ ہم اب تک اورنگ زیب کو ایک سادگی پسند دربار دار بادشاہ، بہادر سپاہی، سپہ سالار اور سخت گیر اور بے لچک انسان کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں۔ اس لئے جب ہماری نظر کے سامنے اُس کی زندگی کا یہ "تضاد" آتا ہے تو ہمیں حیرت تو ضرور ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ہمارے لئے اُس کی شخصیت میں ایک ایسا حسن اور دلربائی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ اب تک قطعاً محروم تھا۔ قاضی عبدالغفار نے بھی مولانا آزاد کی شخصیت کے "تضاد" کا تذکرہ

کیا ہے اور بتایا ہے کہ "متضاد عناصر کے تصادم" نے اُسے کس طرح متحرک Dynamic بنا رکھا تھا۔ وہ مولانا کی زندگی کے ان متصادم عناصر کا سراغ خود اُن کی تحریروں میں لگاتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں: "مولانا اپنی فطرت کے تضادات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں بارہا بیان فرماتے ہیں 'غبارِ خاطر' کے ایک مکتوب میں پہلے تو آتش دان سے اپنی طبیعت کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اپنے پیراکی کے شوق کو ...... سامنے لاتے ہیں۔" آگے چل کر وہ یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ مولانا اپنی فطرت کے ان تضادات کی وضاحت کیوں ضروری خیال فرماتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "مولانا کے اندر یہ احساس موجود ہے کہ عوام اُن کی زندگی کے تفاوت سے بے خبر نہیں ہیں اور بعض اوقات جب ایسی کوئی واردات پیش آجاتی ہے جس سے یہ تضاد ظاہر ہوتا ہے تو لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک ہی طبیعت کے یہ دو رُخ کیوں کر ممکن ہوئے۔ مولانا اپنے شاعرانہ انداز میں اس تضاد کی تصریح فرماتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بسا اوقات سطح کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے، اُس سے بالکل مختلف بہت کچھ سطح کے نیچے ہوتا ہے۔" مولانا کی شخصیت کے اس "تضاد" پر بھی اُن کی بے پناہ "انفرادیت" کی چھاپ پوری طرح لگی ہوئی ہے اس سلسلے میں قاضی صاحب رقم طراز ہیں: "زندگی کے حقائق کو وہ بار بار اپنے ہی رنگ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ہر چار سطروں کے بعد ایک فقرہ اُن کی بے پناہ اور بے محابا انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے ... مولانا نے اپنی زندگی کے ایک خاص اسلوب کا جو معیار اور زاویہ قائم کر دیا ہے وہ کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ نہ اُن کی خلوتوں میں اور نہ سیاسی مشاغل کی جلوت میں۔"

انسان کے لئے حد سے زیادہ خوشی اور حد سے زیادہ رنج کے مواقع ایسے ہوتے ہیں جب اس کا توازن ذہنی قائم نہیں رہتا اور وہ اپنی انفرادیت کو باقی نہیں رکھ پاتا لیکن مولانا آزاد اس آزمائش سے بھی پوری طرح کامیاب گزرتے ہیں۔ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران میں انھیں اپنی بیگم صاحبہ کی شدید علالت کی اطلاع پہنچتی ہے اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ حکومت برطانیہ سے درخواست کریں تو انھیں بیگم صاحبہ کی تیمارداری کے لئے رہا کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی خودداری انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی اور باوجود اس کے کہ وہ بیگم صاحبہ کو دیکھنے کے لئے بہت بے تاب ہیں مگر غیر ملکی حکومت سے اس قسم کی درخواست کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور قلب و جگر پر جو کچھ گزرتی ہے اُسے برداشت فرماتے ہیں اور اس طرح برداشت فرماتے ہیں کہ روز مرہ کے معمولات میں ذرا فرق نہیں آنے دیتے یہاں تک کہ جیل کے ساتھیوں کو بھی (جن میں اُن کے بعض ایسے قریبی دوست شامل ہیں جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود) حقیقی واردات قلب سے آشنا کرنا پسند نہیں فرماتے، البتہ ایک "غائب از نظر، ہم نشین دل" کے نام ان واردات کو صفحۂ قرطاس پر ضرور مرتسم کرتے جاتے ہیں اور وہ بھی غالباً اس لئے کہ انھیں ان مکتوبات کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کا پورا یقین نہیں ہے۔ اُس زمانے میں مولانا کے محسوسات کتنے شدید تھے اور انھیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ اس کا حال خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ "اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اُسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ، بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے ...... قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی، صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا مگر دل کو نہیں بچا سکا۔" بہر حال جو وقت آنا تھا آکر رہا خیر بدشی کر مولانا کی جو کیفیت ہوئی ہوگی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن اُن کی انفرادیت اس جاں گسل موقع پر بھی کس طرح سرفراز رہی اُس کا حال سنئے: "سب سے پہلے یہ کوشش کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کے جو معمولات ٹھہرائے جا چکے ہیں اُن میں فرق نہ آنے پائے .... چوں کہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے پابند ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اُس کا ساتھ دینا پڑا ... یہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔" یہاں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کم از کم اس موقع پر مولانا کی انفرادیت میں آمد Sp..ntaneity باقی نہیں رہی، بلکہ اُسے قائم رکھنے اور بروئے کار لانے کے لئے انھیں خاص طور پر جدّ و جہد کرنی پڑی اور اسی کا دوسرا نام تصنّع اور بناوٹ ہے۔ اس طرف قاضی عبدالغفار نے بھی اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں: "ضبط و تحمل بھی اسی انفرادیت کے سرفرازانہ مقادر کی گویا

ایک بناوٹ ہے ..... اس بناوٹ کو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے اس موقع پر اپنے ظاہر کو باطن سے متاثر نہ ہونے دیا۔" اس واقعہ سے مولانا کی عظمت کم نہیں ہوتی بڑھ جاتی ہے۔ فطرت کے تصنع اور بناوٹ کی اس طرح نقاب کشائی کرنا ایک بڑے آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ہر کہ ومہ اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت نے انھیں جیسے سیاست اور ادب میں ایسے ہی مذہب میں شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے وہ ایک علمی اور مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور اس لئے مذہب اُن کی گھٹی میں پڑا تھا لیکن ورثے میں انھیں مذہب کا جو تصور ملا تھا وہ بہت جامد اور بے روح تھا، وہی تقلیدی اور آبائی مذہب جو ہم میں سے اکثر لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ لیکن مولانا اس پر کیسے قانع رہ سکتے تھے! زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اُن کے دل میں شک کا کانٹا چبھا اور اُس کی خلش اتنی بڑھی کہ اُس نے انھیں الحاد اور بے دینی کی سرحد تک پہنچا دیا، مگر مولانا قدرت سے طبعِ سلیم اور فکرِ رسا لے کر آئے تھے اس لئے اُن کے قدم یہاں رُک نہیں گئے بلکہ جلدی ہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے جو مذہب کا اصلی مقصود ہے۔ جس عمر میں دوسرے لوگ زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اُس عمر میں مولانا سفر کی تکان دُور کر رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا کے مذہبی عقائد سے خاصی طویل بحث کی ہے لیکن چوں کہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اُس کے بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتے، البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ یہ مولانا کی انفرادیت ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ مذہبِ اسلام کو عورتوں کی ترقی، موسیقی کے ذوق، جہادِ حریت، متحدہ قوم کی تشکیل اور غیر مسلم موحدین کی نجات کی راہ میں حائل نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ اپنے ان عقائد کے اظہار میں انھیں ایک طرف بچے اور عمامے والے بزرگوں سے اور دوسری طرف اپنے سیاسی مخالفوں سے بہت کچھ سُننا اور سہنا پڑا۔

کسی شخص کی انفرادیت اور عظمت کو سمجھنے کے لئے اُس کے ہم عصروں سے اُس کا مقابلہ و موازنہ بہت مفید ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جیسے ماحول میں رہ کر ایک جیسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف لوگوں نے کس طرح کا طرزِ عمل اختیار کیا تو ہمیں اُن کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کا مقابلہ و موازنہ اُن کے دو جلیل القدر ہم عصروں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال سے کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہی دو بزرگ ایسے ہو سکتے تھے جن سے مولانا آزاد کا موازنہ کیا جاتا، اس لئے کہ موجودہ صدی کے نصف اوّل میں اسلامی ہند کو صحیح معنی میں یہی تین شخصیتیں ایسی میسّر آئیں جو دل و دماغ کی صلاحیتوں سے پوری طرح متصف تھیں اور جنھوں نے بعد میں آنے والوں کے لئے اپنے طرزِ عمل اور کردار سے جاندار اور صالح روایتیں قائم کیں۔

مولانا محمد علی ایک عملی انسان تھے اور اُن کا "عشق" انھیں آتشِ نمرود میں کود جانے کے لئے آمادہ رکھتا تھا لیکن وہ مولانا آزاد کی طرح علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر متمکن نہیں تھے اور اس لئے اُن میں ضبط و تحمل اور استقلال و استقامت کے وہ بلند پایہ اوصاف نہیں پائے جاتے تھے جو مولانا آزاد کی انفرادیت کے سب سے روشن مینارے ہیں۔ اسے قاضی عبدالغفار اس طرح لکھتے ہیں: "مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر تھے اور ایک عمومی لیڈر کی طرح اپنے بادبانوں کا زاویہ ہوا کے رُخ پر قائم کر سکتے تھے۔ مولانا (آزاد) اس مفہوم اور انداز کی عمومیت سے تقریباً بے گانہ رہے ..... کبھی ان دونوں کے طرزِ فکر میں کوئی نقطۂ اتصال پیدا ہی نہ ہو سکا ..... ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ذہنی خلیج حائل ہے جس پر کوئی پُل نہیں باندھا جا سکتا ..... مولانا محمد علی بسا اوقات اپنے نقاد اور مخالف سے دست و گریباں ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت اُن کی صحافت کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا لیکن مولانا (آزاد) بعض اوقات دوسروں پر اس لئے تنقید یا تعریض نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ کوئی احساسِ کم تری نہیں بلکہ ایک بہت ضدی اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدانِ جنگ میں اس لئے نہیں جاتی کہ اُسے کوئی برابر کا حریف نظر نہیں آتا۔"

ڈاکٹر اقبال عملی انسان بالکل نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی اور مفکر تھے اور اس لئے اُن کا موازنہ مولانا آزاد سے فکر و نظر کی دُنیا ہی میں کیا جا سکتا ہے ان دونوں کے درمیان جو چیز سب سے زیادہ مشترک ہے وہ رمزِ خودی اور عرفانِ حیات کا فلسفہ ہے لیکن اس باب میں بھی مولانا آزاد کو ڈاکٹر اقبال پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی تشریح قاضی عبدالغفار اس طرح کرتے ہیں:۔

"اقبال رمزِ خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لئے پیش کرتے ہیں، اُسی کو اپنا مخاطب بناتے ہیں اور اُسی کو زندگی کا پیام دیتے ہیں مگر مولانا کا فلسفۂ حیات اقبال کے تصورات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ اقبال سے

نہادہ "مذہبی" ہونے کے باوجود خود شناسی کے فطری تقاضوں کو انسانیت ہی کو ہر جاندار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں..... اقبال صرف مسلمانوں کے لئے قوتِ عمل کا ایک نسخۂ تجویز کرتے ہیں اور مولانا تمام مخلوقات کی اُس قوتِ نمو کا ذکر کرتے ہیں جو اس میں ودیعت ہے..... اقبال اپنے بلند ترین افکار میں انسانیت کے تصوّر سے اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ صرف اسلام اور مذہب کے تصوّر سے..... اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لئے فرقہ پرستی کا ایک فتنہ انگیز کھلونا بن گیا ورنہ خود شناسی اور خودی کا وہ فطری عمل جس کو مولانا نے ایک چڑیا کے بچے کے پروں میں کارفرما دیکھا، انسان کے پیکر میں اور بھی زیادہ نسل اور فرقہ اور مذہب کی تنگ نظری سے آزاد ہے"

مولانا آزاد کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے قاضی عبدالغفار نے اُن کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی اِس کوشش میں انھوں نے زیادہ مدد مولانا کی تحریروں خصوصاً "غبارِ خاطر" سے لی ہے۔ لیکن انھیں مولانا سے یہ شکوہ ہے کہ انھوں نے "اپنی اس نثر میں شعر کی تمام لطافتیں اس طرح سمو دی ہیں اور شاعرانہ اشارات و کنایات سے اس قدر کام لیا ہے کہ تنقید اور تبصرے کی راہ دُشوار گزار ہوگئی ہے اور مغالطے سنگِ راہ ہو سکتے ہیں۔ اُن کی شعریت نے ایک چادر بن کر اُن کے حقیقی تاثرات کے چہرے کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات پر تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نقطے پر شاعری ختم ہوئی اور حقیقت شروع ہوئی!" پھر اِسی قسم کا شکوہ ہمیں قاضی عبدالغفار سے بھی ہے۔ جو کسر مولانا کی شعریت سے باقی رہ گئی تھی اُسے قاضی صاحب کی شعریت نے پورا کر دیا اور تنقید اور تبصرے کی راہ اور بھی دشوار گزار ہوگئی۔ بہرحال کہا جا سکتا ہے کہ "آثارِ ابوالکلام آزاد" مجموعی طور پر ایک عظیم اور "مشکل شخصیت" کو سمجھنے اور اُس کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کی خاصی کامیاب کوشش ہے، اگرچہ یہ اور زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی اگر عقیدت کے ساتھ تنقید سے بھی کام لیا جاتا اور "مشکل شخصیت" کا تاثر پہلے ہی ذہن میں قائم نہ کر لیا جاتا۔

حیاتِ امید و موتِ قنوط

"مایوسی سے بڑھ کر کوئی شے انسان کے لئے قاتل و مہلک نہیں اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا کیا ہے، سمندر کی تباہی کو مغلوب کیا ہے اور جب چاہا ہے اس میں اپنی سواری کے مرکب چلائے ہیں اور جب چاہا ہے اس کے کناروں کو میلوں اور فرسنگوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر امید ہی ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے: بسترِ مرگ سے بیماروں کو اٹھایا ہے اور ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے، بچوں کو جوانوں کی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے۔

جبکہ قوتیں جواب دے دیتی ہیں، جبکہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے، جبکہ زمین کے کسی گوشے سے صدائے ہمت نہیں آتی اور جبکہ تمام اعضائے عمل جواب دے دیتے ہیں تو امید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے جو مسکراتا ہے، اپنے پَروں کو کھولتا ہے اور اس کے سایے میں سے کر قوت و طاقت، ہمت و مستعدی جستی و چالاکی کی ایک روحِ تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے پہلی چیز امید ہے۔ جب تک انسان کے اندر امید قائم ہے، مصیبتوں اور ہلاکتوں کے اگر عفریت بھی سامنے آ کھڑے ہوں تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

اگر خون اور اس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لئے ضروری ہے تو یقین کیجئے کہ اخلاقی و ادبی حیات کے لئے امید اس کے اندر بمنزلۂ روح کے ہے۔ جب تک اس کا دوران دل سے اُٹھ کر دریا بصطلاح حال دماغ سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں حرارتِ عمل پیدا کر رہا ہے، اس کی قوتِ عمل زندہ، اس کے اعضائے کار متحرک اور پائے مستعدی سرگرمِ تگاپو ہیں۔ لیکن جہاں یہ روحِ حیات دل سے نکلی پھر جسم انسانی کے لئے قبر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔"

("الہلال" ۹۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

حمیدہ سلطان

زلیخا

نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، جڑی بھوئیں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بھرا چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے گھنے بال، بوٹا سا قد، مائل بہ گداز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی یا ریشمی ساڑی بے پروائی سے پہنے مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں "یوسف ہندی" حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم تھیں۔

میری عمر سات یا آٹھ سال کی تھی دلّی میں ایک زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی اس کی صدارت بیگم صاحبہ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے کی۔ ان کے ہمراہ مولانا آزاد کی دونوں بہنیں آبرو بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ ان دونوں کے علم و فضل اور عالمانہ خطبوں کی دھاک پڑھی لکھی خواتین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چوں کہ والدہ صاحبہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی ایک رکن تھیں اسی لئے ان کی میزبانی کا شرف ہمارے گھر کو ملا۔ اس طرح دوستی کی بنیاد پڑی۔ پھر یہ مراسم دن بدن بڑھتے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں ابا جان کی وفات کے بعد تین سال ہمارا کلکتہ رہنا ہوا تو تعلقات بالکل عزیزانہ ہو گئے۔ یہ دونوں اپنے محترم بھائی سے ملنے بھوپال آئیں تو ہمارے یہاں بھی آئیں۔ پھر اپنی چہیتی بھاوج بیگم زلیخا آزاد سے والدہ صاحبہ کو ملایا۔ مولانا آزاد اس زمانے میں بالی گنج کی ایک شاندار دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ والدہ مرحومہ پرانے زمانے کی بہت رکھ رکھاؤ والی بیوی تھیں۔ مگر ادھر تو بیگم آزاد کی پاکیزہ صورت، دل نشین اداؤں نے ان کو کھینچا، ادھر وہ بھی شرمیلی اور کم آمیز ہونے کے باوجود کچھ ایسی گھل مل گئیں کہ بلا ناغہ ایک ہفتہ یہ وہاں جاتیں دوسرے ہفتہ وہ یہاں آتیں۔ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں۔

وہ سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی بخوبی واقف۔ مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ شیریں زبان بھی۔ سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں۔ چونکہ آپس میں کافی بے تکلفی تھی اس لئے نند بھاوج کے رشتے کو لے کر دونوں میں مذاق بھی ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ صبح دس بجے کے بعد یہ ان کے یہاں پہنچیں تو خلافِ عادت اس دن وہ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور معانقہ کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئیا بھئی! آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی۔ بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دو چمچے اُبلے ہوئے چاول، تھوڑی دال، سبزی یا گوشت اور دہی۔ چونکہ صبح بہت سویرے اٹھ جاتے ہیں اس دوپہر کے کھانے کے بعد بارہ بجے سے بھی پہلے لیٹ جاتے ہیں۔ پھر دو بجے غسل کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ملنے والوں کا تانتا رات گئے تک لگا رہتا ہے۔"

بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کی طرف اشارا کر کے یہ بولیں "مگر بھاوج ہوتا ہے ہمارے بھائی کو آپ کی یہ زلفِ پریشاں بہت پسند ہے جو آپ نہیں گوندھتیں"

وہ جس انداز سے لجا کر بولیں "اے نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ ان بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ ایسی خفقانی ہو گئی ہے کہ چوٹی گوندھنے سے دل گھبراتا ہے"۔ وہ اندازِ حجاب آج بھی مجھے یاد ہے۔ کیسی باحیا بیوی تھیں اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتے بھی شرماتی تھیں۔ یہ اس دن ان

تقلید کرنے کی ٹھان کر گئی تھیں۔ پھر ان کی خالی کلائیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "اے توبہ! ایسی بھی کیا سادگی، وہم نہیں آتا۔ اللہ تمھارا سہاگ قائم رکھے ایک ایک چوڑی ہاتھوں میں ڈال لیا کرو۔"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آخر ہیں نا آپ بھی نند! بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں۔ اچھا آئندہ میں آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی۔" دوسرے ہفتے جو وہ ملنے آئیں تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی۔ چکن کا خوشبو بیل لگا بلاؤز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساری زیب تن تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی دو دو چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بندے، اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی موہنی صورت کو اور بھی دل ربا کر دیا تھا۔ یہ ان کو گلے لگا کر مسرور لہجے میں بولیں۔ "اے ہے کہیں بری نظر نہ لگ جائے۔ آج تو ماشاء اللہ چشمِ بد دور بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ حسبِ عادت لجا کر بولیں۔ "آپ کو خوش کرنا تھا۔ ورنہ مجھے تو اب رنگین کپڑے اور زیور پہنتے شرم آتی ہے۔" "اے ہے لو اور سنو حد کر دی تم نے بھی۔ ابھی تمھاری عمر کون سی ایسی ہے۔ یہ بیگمیں تو بڑھاپے میں بھی رنگا رنگ پہنتی ہیں،" انھوں نے کہا۔

مجھے ہر بار کتابوں کا لالچ جانے پر مجبور کرتا۔ مولانا صاحب کی لائبریری اوپر زنانے میں ہی تھی۔ میں جاتے ہی لائبریری میں گھس جاتی اور کتابیں وہاں سے لاتی پھر ان کو پڑھ کر رکھ دیتی اور لے آتی۔ میرے ذوق کی تسکین کا سامان فراوانی سے ملتا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسی لائبریری میں ہی پہلی مرتبہ میں نے مولانا کی زیارت کی۔

اوائل گرمی کی ایک شام تھی۔ وہ دونوں بیبیاں باتوں میں لگیں۔ میں حسبِ معمول لائبریری میں پہنچ گئی۔ ایک سرخ و سفید رنگ کا تیکھے خط و خال والا انسان سفید کرتے پاجامے میں ننگے سر کتابوں کے ارد گرد ڈھیر لگائے مطالعہ میں ایسا مصروف تھا کہ میں قریب پہنچ گئی اس کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے پڑھتا رہا۔ میں الٹے قدموں واپس ہوئی تو وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔ "کیوں کتابیں نہیں لیں؟" میں نے کہا "غالباً آج لائبریری میں مولانا صاحب تشریف رکھتے ہیں اسی لئے واپس آ گئی۔"

"ارے ہاں وہی ہوں گے آج کل ان کو ذرا فرصت ہے۔ اکثر شام کو ملنے والوں سے بچ کر لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن تمھارے تو ماموں ہیں۔ آؤ میرے ساتھ چلو میں ان سے تم کو ملوا دوں۔" انھوں نے ایک خاص انداز سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ میں ڈرتی جھجکتی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انھوں نے میرا تعارف کرایا۔ مولانا صاحب نے مسکراتے ہوئے مہربانی کے لہجے میں فرمایا۔ "آؤ بھئی جو کتاب چاہو لے لو۔" اور میں بُت بنی کچھ دیر اس عظیم انسان کو دیکھتی رہی جو دنیائے علم و ادب، خطابت، مذہب، سیاست کا خورشیدِ تاباں تھا۔ مولانا علیہ الرحمۃ کی عظمت کا نقش میرے دل کے سادہ ورق پر اسی دن بیٹھا۔ پھر عمر کے ساتھ میری عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا۔ "کیا رتجگا کیا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔"

وہ ہنس کر بولیں "آپ کی تو عادت ہے ہی بنانے کی۔ آج کل مولانا قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے۔ باہر بھی حبس ہی رہتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔"

یہی تھا اس نیک بی بی کا وہ جذبۂ رفاقت جس کو یاد کر کے مرنے والی کے غم میں مولانا پر احمد نگر قلعہ میں ایک پرانی قبر کو دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

بڑے آدمیوں کے سوانحِ حیات جب لکھے جاتے ہیں تو اکثر ان کی خانگی زندگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کے متعلق یہ جانیں کہ ان لوگوں کے گھریلو حالات کیا تھے اور اپنی بیوی سے ان کا برتاؤ کیسا تھا۔

مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے معصوم لڑکے تھے اور زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منی بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین صاحب بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے جا کر ملتا تھا۔ یہ آفتاب الدین صاحب مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی انھوں نے پیر کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ انھوں نے بہت محبت سے اس حسین پیاری بچی کو گود میں لیا اور زلیخا نام رکھا۔ بعد میں موہنی صورت والی بچی ان کو اتنی اچھی لگی کہ اس کو انھوں نے اپنی بہو بنا لیا۔ چھ سال کی بالی عمر میں زلیخا بیگم بیاہ کر آئیں۔ ان کے ننھے سے دل پر اسی وقت سے

بی اپنے یوسف جاں شوہر کا قبضہ ہو گیا اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اس عظیم انسان کی پرستش کرنے لگیں۔ مولانا کے ہر خیال کو عزوجل سر آنکھوں پر رکھا۔ ہجر کی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر لب پر کبھی اُف تک نہ لائیں۔ مولانا صاحب کی مالی حالت سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اگر ان کو اتنی مہلت ملتی کہ وہ صرف ادبی کام کرتے تو یقیناً دولت کی دیوی ان کے قدموں کو چومتی مگر ان کا احساس دل مجاہد نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ انھیں پس ماندہ قوم اور غلام ملک کا غم چین نہ لینے دیتا تھا۔ ان کی شعر نفسی اور آتش بیانی قلم و زبان سے دلوں کو گرماتی رہتی۔ اور ان کی رفیقِ حیات نہ اچھا کھاتی نہ اچھا پہنتی۔ ان تمام تکالیف کو محبت اور سکون سے برداشت کرتی جو شوہر کی جدائی اور مالی پریشانی کی وجہ سے اس پر گذرتیں۔ زلیخا بیگم کا زیادہ وقت یادِ الٰہی اور مولانا کی کامیابی کی دعاؤں میں گذرتا۔ ہر وقت کڑھتے رہنے کے باعث ان کی صحت گر گئی تھی مگر یہ ستونتی اپنی دھن میں مگن رہی۔ اپنی خرابیٔ صحت کا ذکر کبھی مولانا سے نہیں کیا۔ جس وقت بھی اور جتنے دن بعد بھی وہ گھر آتے یہ پاک طینت بیوی مسکراتی ہوئی ہمہ تن شوق بن ان کا استقبال کرتی اور ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تاکہ یہ تھکا ہوا دماغ جس کو سیاسی گتھیاں بھی سلجھانی تھیں اور مذہبی و ادبی کام بھی کرنے تھے گھریلو آرام وہ فضا میں آرام پاکر اور زیادہ ہمت و جوش سے کام کر سکے اور مولانا صاحب اسی پیکرِ صبر و ایثار کی بدولت ہر مرتبہ نیا ولولہ اور جوش لے کر جنگِ آزادی کے لئے تیار ہو جاتے۔

وہ فطری طور پر آزاد طبیعت اور والہانہ جذبات کے مالک تھے۔ اس لئے اپنی کم عمری کی شادی سے ایک دوسرے بڑے فنکار غالب کی طرح خوش نہیں تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو اپنی باوفا محبت کرنے والی بیوی کا خیال نہیں تھا یا ان کی ازدواجی زندگی رحمی نہیں گزری۔ زلیخا بیگم کی وفات کے بعد انھوں نے جو خط صدر یار جنگ کو لکھا ہے اس سے ان کے بے اندازہ غم کا اظہار ہوتا ہے۔

جب ۱۹۴۲ء میں مولانا کو اور تمام لیڈروں کے ساتھ احمد نگر قلعہ میں نظر بند کیا گیا زلیخا بیگم کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو رہا تھا اور صورتِ حالات بہت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں سیاسی نظر بندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے چہیتے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سن کر وہ تڑپ کر رہ جاتیں۔ اُن کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی۔ دق کا نامراد مرض دو سال سے پیچھا کئے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا۔ ڈاکٹر بی سی رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا۔ مگر مرض کو افاقہ کیسے ہوتا جب کہ نہ دوا تھی نہ غذا۔ وہ ہر ایک معالج سے یہی کہتی تھیں۔ "بس خدا کے لئے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو۔" ان کی حالت دیکھ کر اور التجا سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہر ڈاکٹر چارپائی سے اُٹھتا تھا۔ آخر بقول مولانا صاحب کے ۹- اپریل ۱۹۴۳ء کو وہ پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا۔ زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کے دیدار کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جسدِ بے جان کو سپردِ خاک کر دیا گیا اور روح شاید قیدِ جسم سے آزاد ہو کر بھی اپنے یوسف کے گرد پھر رہی ہوگی۔

مولانا صاحب 'غبارِ خاطر' میں نواب صدر یار جنگ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

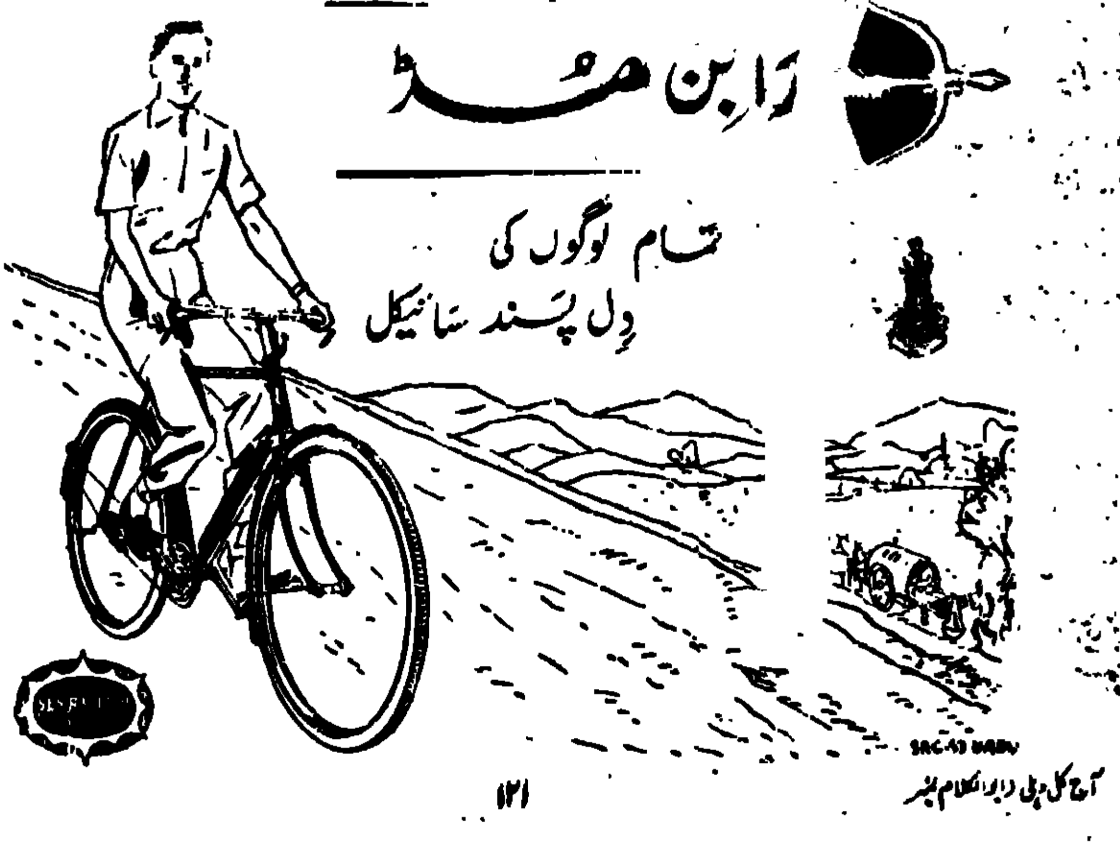
"گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر درپیش ہوئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ میں نے اس درجہ افسردہ اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس پر غالب آ گئی تھی۔ میں نے اس وقت تو ایسا ہی خیال کیا لیکن آج سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

غم گسار و شفیق صفت بیوی کے بعد مولانا صاحب کی زندگی کے معمولات میں تو بظاہر فرق نہیں آیا لیکن اُن کا دل جل گیا۔ وجودِ معنوی سراپا درد بن کر رہ گیا۔ اس جانگزا غم کے زیرِ اثر انھوں نے غبارِ خاطر کے ایک خط میں اپنے کو شاخِ بریدہ سے تشبیہ دی ہے جس کو موسمِ بہار کی جانفزا ہوائیں بھی تازگی نہیں بخش سکتیں۔ اپنے غمزدہ دل کو تھام کر بے اختیار فرماتے ہیں:۔

شاہ بخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

ان کا دل حزن اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ رہا ہونے کے بعد جب وہ اپنی زلیخا کی آخری آرام گاہ پر گئے تو باوجود اس بے انتہا ضبط و تحمل کے جو اُن کی طبیعت کی خاص خصوصیت تھی اپنی چاہنے والی کے مرقد پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کئے بغیر نہ رہ سکے۔ دو ایک وقت کو تھامنا ان کے بس میں نہ رہا اور بہت دیر تک وہ سر جھکائے روتے رہے۔ مولانا صاحب کی صحت بیوی کی وفات کے بعد دن بدن خراب ہوتی گئی اور مزاج کی شگفتگی بھی بہت کم ہو گئی۔ وہ بذلہ سنجیاں جو اُن کے مخصوص احباب کی محفلوں کو کشتِ زعفران بنا دیتی تھیں برائے نام رہ گئیں۔ وہ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ زلیخا بیگم کی زندگی میں اُن کو غالباً یہ احساس نہ تھا کہ اس باوفا بیوی سے خود اُن کو بھی دلی لگاؤ ہے۔ لیکن مرنے والی کے جانے کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اپنی زندگی کی یہ متاعِ عزیز بھی ملک و قوم پر وہ نچھاور کر چکے تھے۔ اس خدا کی بھری ہوئی دنیا میں ان کے لئے کاموں اور مرحومہ کی یاد کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے جیسے اور بہت سی نوازشوں سے مولانا آزاد کو نوازا تھا وہاں ایسی باوفا نیک طینت پاکیزہ صورت بیوی بھی عطا فرمائی تھی۔ زلیخا بیگم کی ذات پر عالمِ نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے۔ جس نے حسن و جمال کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ میرا یہ کہنا غلط نہیں حقیقت ہے۔ میری مرحومہ ماں حسن کی مورت تھیں اور بھی حسین و جمیل خواتین کو دیکھا لیکن جیسی معصومیت اور تقدس بیگم آزاد کی صورت پہ میں نے دیکھا ایسا پھر کبھی کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اس دنیا کے آب و گِل کی بنی ہوئی ہستی نہیں آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی پاکیزگی خیال کا یہ عالم تھا کہ کبھی ٹیلیفون کا ریسیور اس لئے نہیں اٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی بات کر رہا ہوگا۔ اس زمانے میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۴۷ء کے بعد میں اکثر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی تھی۔ جب بھی میں حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں مرحومہ کا ذکر میں نے کیا۔ مولانا صاحب ایکدم اس طرح خاموش ہو گئے گویا اس ذکر نے ان کے دل پر نشتر لگا دیا۔ وہ بہت دیر سرنگوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی دم بخود پشیمان سی بیٹھی ان کے اس جانکاہ غم کا اندازہ کر رہی تھی۔ . . . . . آخر یہ مفارقت کا طویل زمانہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی آدھی رات کو ختم ہو گیا اور مولانا صاحب کی مقدس روح اپنی زلیخا کی تلاش میں عالم جاوداں کو سدھار گئی۔



غلام احمد فرقت کاکوروی

نگارشاتِ آزاد میں طنز و مزاح

ابتدائے آفرینش سے اب تک شاید ہی کوئی ہستی ایسی گزری ہو جس کی زندگی میں وہ لطیف اور پُرمسرت لمحات نہ آئے ہوں جن میں انسان کا ہنسنے ہنسانے کو دل چاہتا ہے اور وہ دوسروں سے چہلیں کرکے اپنے لئے لطف و مسرت کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اس میں ثقہ اور غیر ثقہ، مہذب اور غیر مہذب، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کی تخصیص نہیں ہوتی۔

این سعادت بزورِ بازو نیست ۔۔۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہت سے لوگ جو بظاہر بیحد سنجیدہ، مذہبی، خاموش اور اپنے آپ کو بہت ہی لئے دئے نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی بعض بعض اپنی نجی زندگی میں بے حد شوخ اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خلوت و جلوت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی انھیں بزرگوں میں سے تھا جو بظاہر خاموش اور بہ باطن ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ جن لوگوں سے مولانا کی بے تکلفی تھی اُن کا کہنا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں نہ صرف بے حد شوخ، ہنس مکھ اور بذلہ سنج ہی تھے، بلکہ ضلع جگت اور رعایتِ لفظی یا فقرے چست کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اُن کی فقرے بازی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں قائم کی تھی:

" ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا ہو تو مولانا ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بہ سرعت یہ قلعہ بنا ڈالیں گے۔ لیکن جب یہ قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو کیونکہ وہ پھر اُسی قلعہ کو ڈھا دیں گے۔"

اُردو زبان اگرچہ دنیا کی دوسری مشہور زبانوں کے مقابلے میں ایک نو عمر اور کم عمر زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں طنز و مزاح کا سرمایہ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم ہے مگر اس مختصر سے سرمایہ میں بھی وہ چمک دمک اور وہ پختگی ہے کہ پڑھنے والا اس کی عمر میں شک کرنے لگتا ہے۔ اور ایک دوسری خصوصیت اس زبان کے بعض لکھنے والوں کی یہ ہے کہ متانت اور ظرافت دونوں میدانوں میں ایک جیسے رستم اور مردِ میدان کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا جو اگر دنیا کی دوسری زبانوں کے ممتاز طنز نگاروں میں گھر لے کر دئے جائیں تو بہتوں کی نگاہیں ان پر جم کر رہ جائیں گی۔ اور ہم ان کے طنز کو پورے اعتماد کے ساتھ دنیا کی بڑی زبانوں کے انشاپردازوں کی نگارشات کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ اُن کی تحریر میں ایک ایسی انفرادیت پائی جاتی ہے جو اردو کے کسی طنز نگار یا انشاپرداز کے یہاں نہیں ملتی اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک جداگانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اُسی طرح ان کا طرزِ تحریر بھی تمام ادیبوں اور طنز نگاروں سے الگ تھلگ تھا۔ ان کے سوچنے کا انداز اُن کی ذات اُن کے لئے۔ ان کی عبارت اور الفاظ کی نشست و برخاست سب میں ایک انوکھا پن ہے۔ جب وہ نثر لکھتے لکھتے آخر میں کوئی شعر لکھ دیتے ہیں تو پوری عبارت میں ایک ترنم اور موسیقی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پوری نثر اس طرح جگمگا اُٹھتی ہے کہ نثر پر نظم کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں ایک برجستگی اور بے ساختہ پن ہے۔ 'غبارِ خاطر' میں ایک جگہ جب وہ ہندوستانی اور چینی چائے پر لوگوں کو رد و قدح کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے ایک خط میں نہایت شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ لکھتے ہیں:-

"دراصل یہ عالمگیر غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انھوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے اُسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کامیاب ارزاں ہو بے سمجھے بوجھے اس پر ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجتماع کر لیا اب آپ سر پیٹیے سنتا کون ہے

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ محشر
کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں"

مولانا کی بہترین مزاح نگاری اور بذلہ سنجی کی مثال ان کے ۷، ۱۱ اور ۱۸ - مارچ ۱۹۴۳ء کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھے ہیں۔ ان میں چڑیوں کے تدارک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے۔ میں نے اُٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا کبھی حریفوں کی بلند آشیانی بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا

خیالِ قدِ بلندِ تو می کند دلِ من
تو دست کوتہِ من بین و آستین دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا دوڑتا ہوا گیا اور اسے اُٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اُٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا

بیک تاختن تا بہ یک تاختن
چہ گردن کشاں را سر انداختن"

یہ واقعہ ہے کہ جس طرح مولانا کا ایک مخصوص اندازِ بیان ہے اُسی طرح ان کے موضوعات بھی مخصوص ہیں۔ ہر موضوع ان کے اندازِ تحریر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کی خطابت، ان کی تقریر کا انداز اور اپنے مافی الضمیر ادا کرنے کا لب و لہجہ دوسرے لکھنے والوں سے بالکل ہی مختلف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کے سوچنے کا انداز بھی سب سے جداگانہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اردو مزاح میں ایک چیز رعایتِ لفظی ہوتی ہے جس سے بعض مشاق مزاح نگار بڑا ہی لطف پیدا کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا نہ صرف ایک خاص قسم کی گدگدی محسوس کرتا ہے بلکہ مسکرا مسکرا کر زبان کے چٹخارے بھی لیتا رہتا ہے۔ مولانا جہاں رعایتِ لفظی سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہاں بھی وہ اس فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔ احمد نگر میں ایک مرتبہ باورچی کی دقت پیش آئی۔ قیدیوں میں کوئی باورچی نہ تھا۔ چیتہ خاں (سپرنٹنڈنٹ جیل، یہ نام مولانا کا رکھا ہوا تھا) اس سلسلے میں بڑی مستعدی اور سرگرمی دکھاتا۔ جہاں چہ ایک باورچی کا شہر کے کلکٹر نے انتظام کر دیا۔ دوسرے روز جب وہ اس قلعے میں لایا گیا تو اس کا حلیہ اور اس کی تصویر مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو

"دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طباخ (باورچی) موعود یہی ہے

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا تھا لیکن کچھ

ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا ماتم کرنے لگا۔"

ایک مصیبت اس بدنصیب باورچی کے ساتھ یہ بھی تھی کہ اسے قلعہ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ حکومت کے لئے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس باورچی کو رکھا کہاں جائے۔ اس مقام پر مولانا نے رعایت لفظی سے جو مزاح پیدا کیا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"اسے کلکٹر کے یاران طریقت کی عقلمندی سمجھئے یا بے دردی کہ اسے پہلا فیصلہ کر یہاں کے مقامی قید خانے میں بھیج دیا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قیدخانے کی کوٹھری ہی تھی۔ قید خانے میں جو اُسے رات دن قید و بند کے قصے پیش آئے تو بےچارہ کھانے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اُس احمق کو کیا معلوم تھا کہ سالن روٹی کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اس ابتدائے عشق ہی نے کمر نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی تیار ہو گیا

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا"

مولانا کے طنز میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اخلاص، سچائی اور صداقت کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ان کا طنز ہنگامی نہیں بلکہ دوامی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ عموماً طنز کے حربے کو ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مولانا کا طنز اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا کے مخصوص موضوعات سیاسی اور سماجی دونوں قسم کی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں پہلے اُسے خود محسوس کرتے ہیں اور جب پورے طور پر اُس جذبے کی اپنے دل میں پرورش کرتے ہیں تب اس کی اپنے الفاظ اور اپنے قلم کی تلوار سے کانٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ ان کی انشا پردازی الفاظ کا گھروندا نہیں ہوتی۔ وہ ایک سیلاب، ایک طوفان بلاخیز کا دھارا اور ایک شمشیر بیدار ہے جس پر سنجیدگی اور متانت کی نفیس صیقل بھی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی مثال ایک پہلوان سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ابوالکلام کی مثال اُس پہلوان کی ہے جو وسط میدان جنگ میں مبارز طلب ہو اور دوسروں کا نہیں بلکہ اپنے رجز سے خود اپنا دل بڑھا رہا ہو۔"

جیل میں ڈاکٹر محمود کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ وہ طشتری میں دانہ لئے پرندوں کو آ آ کر کے بلاتے مگر ان آہوان ہوائی میں اتنی سمجھ کہاں جو وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف توجہ بھی کرتے۔ سید محمود اپنی اس ناکامی پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ مولانا اُن سے کچھ پوچھتے ہیں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر سید محمود کہنے لگے۔

"سید محمود کہنے لگے۔ عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اُتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں گویا دانے کی پیش کش بھی ایک جرم ہوئی

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اُٹھایا ہے تو عشوۂ ناز کے تغافل کیشیوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیاز عشق کے دعوؤں کے ساتھ نازکُسی کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں۔" ....

جب ڈاکٹر سید محمود مینائوں کو دانہ دکھانے پر بھی اپنی طرف ملتفت نہیں کر سکے تو مولانا لکھتے ہیں:۔

"شہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا ہے۔ میں نے کوؤں کو دریوزہ گران ہرجائی اس لئے کہا کہ کبھی انھیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ ہمہ دانے پر پہنچے صدائیں لگائیں اور چل دئے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے"

جب ڈاکٹر سید محمود کو رفتہ رفتہ اپنے مقصد میں کامیابی ہونے لگی اور بجائے مینائوں کے دوسرے پرندے اور جانور اُن کی طرف متوجہ ہونے لگے تو مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

"صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا تناور درخت ہے اُس پر گلہریوں کے جھنڈ کے جھنڈ رہتے ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

تو فوراً لبیک اور مرحمت عالی زیادہ کہتے ہوئے اس دستر خوان پر ٹوٹ پڑیں

یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

پھر ذرا گردنیں اُٹھالیتیں۔ ٹکڑا چباتی جاتیں اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے

بھی کرتی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو داد ضیافت دیتے ہوئے بطریق حسن طلب یہ بھی کہی جاتی ہیں کہ

گرچہ خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں!

ڈاکٹر سید محمود کی سخاوت سے متاثر ہو کر جب قلعۂ احمد نگر پہ کوؤں کی پرورش شروع ہو گئی تو ان سے کہا گیا کہ حضرت اگر ممکن ہو تو فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیجئے۔ اس پر مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

" ابھی سید محمود صاحب اس درخواست پر غور ہی کر رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آگیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پہ دو معزز مشتنگڑے بھی تشریف لائے ہیں۔

پیری سے کمر میں اک ذرا خم — تو قیر کی صورت مجسم

اور گردن اٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں،

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی "

پھر جب وہ لنگر خانہ بند کر دیا گیا تو اس کے بند ہونے پہ مولانا لکھتے ہیں:۔

" ان کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی کہ ادھر ان کا مبارک قدم آیا اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ ان کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھئے کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آگیا

صبح ہی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب

مقصد کعبہ کا نہ کیجے گا بہ ایں یمنِ قدوم "

اب تک مولانا کے طنز و مزاح کے جو نمونے پیش کئے گئے وہ صرف ان کی کتاب "غبارِ خاطر" سے تھے جن میں ان کے اُنتیس مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ بھی ان کے اخبار "الہلال" میں حدیث الغاشیہ کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا جس میں ان لوگوں پر طنز ہے جو ایک دن قبل تک مسلم یونیورسٹی کے متعلق حکومت کی شرائط قبول کرنے کے بدترین مخالف تھے مگر رات کو لفٹیننٹ گورنر کے یہاں کھانا کھانے کے بعد انھوں نے اپنی رائیں بدل دیں۔ مگر اس طرح کا طنز صرف ان کے دو ہی تین مضامین میں ملتا ہے۔

" سنتے ہیں خبر اڑی کہ (ہز آنر) کے ہاں (ڈنر) ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور دو نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندی پوچھا کیجئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر اینست و ابرو این و ناز و عشوہ ایں

الفراق اے ہوش و تقوٰی الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبائے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چوبیس گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے جلد تا گوبہ نہیں بلکہ صبح بجے تک اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ و بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب یہی بھی یہ غذائے لطیف کیا تحقیق ہوگی کہ صبح تک معدے میں فرد کش رہے اور آواز پنا نکلیں تو حلق کی جگہ معدے سے۔ مگر افسوس کہ مدت سے روز ہمارے طبی معلومات میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہوا طبی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جتنی لطیف و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے نیز اگر لیفٹیننٹ بھی کہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں ثبوت کے تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔

دل از من، دیدہ از من، آستین از من، کنار از من

لیکن یہ جو کچھ تھا اس پر محض ایک سرسری نظر ڈال کر نہیں گزرنا چاہیے آج کل ہماری نظریں (دھرم پرچار) اور (دو دیوانیاں) کے جنگی طوفانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں اور ابھی نہیں جانا جا سکتا کہ اور کسی طرف دیکھیں۔ تاہم ہم ناظرین سے کہیں گے وہ ان چند ہلکی لہروں سے بھی اغماض نہ کریں جو ۲۶۔ دسمبر کو (گومتی) کی ساکن خاموش سطح میں اٹھی تھیں۔ عجب نہیں کہ کسی وقت یہی گومتی کی لہریں قلزم کے طوفانوں کا کام دیں۔ فی الحقیقت ان جلسوں میں صاحبانِ عقل و فکر کے لئے بہت سی عبرتیں تھیں جن کو ایک ایک کر کے یاد کرنا چاہیئے کیونکہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس تغیرِ افکار و اعمال کی پہلی منزل تھیں جن سے اس تغیر کا مستقبل وابستہ ہے اور جس کی طرف ہم نے پچھلے دنوں صبح امید کے عنوان سے دو افتتاحیہ مضمون لکھ کر توجہ دلائی تھی اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے تفصیل سے لکھیں۔"

یہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا طنز و مزاح اور انداز بیان، جس پر اردو ادب بجا طور پہ فخر کر سکتا ہے۔

فرمودات آزادؔ

دنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی بھی تاج و تخت اور ایوان و محل کے اندر سے نہیں اٹھتی ہے بلکہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ ویران جنگلوں، پھونس کے جھونپڑوں اور پہاڑوں کے اندر رہا ہے۔ اور یہ بھی اس شاہد عجائب پسند کا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ہمیشہ شکستگی اور فاقہ کشی ہی کو محبوب رکھتا ہے۔ اپنا گھر بھی بناتا ہے تو ٹوٹے ہوئے اور زخمی دلوں کو، اپنی آواز بھی سناتا ہے تو کانٹے پڑے ہوئے خشک حلقوں سے، اپنی نگاہوں کا جلوہ بھی دکھاتا ہے تو گردنوں کی خون چکانی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے اضطراب میں، اور پھر اپنے حسن و جمال کا جلوہ گاہ بھی بنائے گا تو تاریک غاروں میں شکستہ دیواروں اور پھٹی ہوئی چٹائیوں کو۔ پھر اگر وہ نہیں ہے تو کون ہے جس کا ناقہ کلیم فقر و مسکینی سے نکلتا ہے اور بادشاہوں کے تخت و تاج کو الٹ دیتا ہے یا کس کی تماشا آرائی ہے کہ چند بے نوا فقیروں کو کھڑا کر دیتا ہے، اور وہ دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کے تسلط سے نکال کر لاکھوں دلوں کو اپنے آگے سربسجود کرا لیتے ہیں۔

•

قومی حیات کا محل اس طرح تعمیر نہیں ہو سکتا کہ پہلے دیواریں کھڑی ہو جائیں پھر اس کی محرابیں اور اطراف و جوانب بھی طیار ہو جائیں گے۔ کشاکش حیات و ممات اور تسابق اقوام کی کش مکش میں فرصت و مہلت کا سکون بغیر خواب ممات کے ممکن نہیں۔ یہاں تو ہر دم اور ہر لمحہ کام کئے جائیے اور ایک ہی وقت میں اس عمارت کے ہر حصہ کی خبر لیجئے۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بن رہا ہے مگر پشت کی طیار کردہ دیواریں گر رہی ہیں۔ اس عالم میں جو کھو گیا وہ پھر نہیں ملتا اور جو وقت غفلت میں کٹا پھر اس کی تلافی کی مہلت نہیں دی جاتی۔

ماں رو عشق سست دریں گشتی نداد بازگشت   جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!

•

اس عالم اثر و تاثر میں ہر چیز کی طرح ہر فعل بھی ایک قدرتی طبیعت اور مزاج رکھتا ہے۔ تخریب کے مزاج میں شورش اور ہولناکی ہے اور تعمیر سرتا سر سکون اور خاموشی ہے۔ تعمیر جمع و نظم ترتیب اور ایجاب ہے۔ تخریب تفرقہ برہمی، اضطراب اور سلب و نفی ہے۔ جمع و نظم کی حالت ہی سکون ہے۔ اور تفرقہ و برہمی کی حالت ہی شورش و اضطراب کی حالت ہے۔ دیوار جب بنتی ہے تو کوئی ہولناکی محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے گرنے میں دھماکا ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر تخریب کا عمل تعمیر سے زیادہ نمایاں اور پر شور ہے۔ تخریب کی ہیبت فوراً ڈرا دیتی ہے لیکن تعمیر کی دل آویزی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ تخریب کا دھماکا دور سے بھی سن لیا جا سکتا ہے لیکن تعمیر کا خاموش عمل دیکھنے کے لئے نزدیک آنے کی ضرورت ہے

•

دہقان ایک بیج اٹھاتا ہے اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو کہ اس ایک بیج کے بار آور ہونے کے لئے قدرت الٰہی نے کس طرح اپنا کارخانۂ ہستی ہتیا کر دیا ہے۔ سورج منتظر ہے کہ اپنی گرمی اس کے لئے وقف کر دے، بادل تیار ہیں کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دیں، زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے وا کر دے۔ لیکن اس تمام کارخانۂ بخشش سے وہ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ خود اس کے اندر کی استعداد صحیح و صالح ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ تمام کارخانۂ بخشش و نوال اس کے لئے بے کار ہوگا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھتے پر بھی اسے گرم نہ کر سکے گا۔ بادل اگر اپنا تمام ذخیرۂ آب ختم کر ڈالے جب بھی اسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔

•

جب آپ ریل سے سفر کرتے ہیں !

تو کیا آپ زیورات، قیمتی پتھر، گھڑیاں، ریشمی کپڑے، شال دوشالے، کشیدے، ساز موسیقی یا دوسری قیمتی چیزیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں !

اگر ایسا ہے تو آپ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ جب آپ ایسی چیزیں ریلوے کے سپرد کریں اور ان چیزوں کے کسی ایک پیکج کی قیمت تین سو روپے سے زائد ہو تو آپ کو یہ کرنا چاہیئے

۱۔ بکنگ کراتے وقت ان چیزوں کی قیمت لکھ کر دے دیں۔ اور

۲۔ بھاڑے کے علاوہ ان چیزوں کی قیمت کا ایک فیصدی حصہ ادا کر دیں۔

اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو ریلوے ان چیزوں کی گمشدگی، ٹوٹ پھوٹ، خرابی یا نقصان کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

مندرجہ بالا چیزیں اور کئی دوسری چیزوں کے نام آپ کو ریلوے ٹائم ٹیبل اینڈ گائیڈ میں Excepted Articles کی فہرست میں ملیں گے۔

اس سلسلے [illegible] اپنے قریبی ریلوے اسٹیشن [illegible] سے حاصل کیجیے

10.Z .. 216

ناردرن ریلوے

ہماری کتابیں

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اِصلاح	۲۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۸ نئے پیسے (فی کاپی)

پچیس روپیہ یا اس سے زیادہ کی
کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائیگا

قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے
ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

[illegible]

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—103